قیمت : -/10

ستمبر 2004

ماہنامہ اردو دنیا

نئی دہلی

"ہمارے بچوں کو کتابیں رٹنے کی بجائے اس بات کا علم ہو
چاہیے کہ "کس طرح زیادہ سیکھا جائے"۔ ہمیں ایسے
اشخاص کی ضرورت ہے جو مفکر ہوں، علم و آگہی کے خالق
ہوں، تخلیقی قوت رکھتے ہوں اور نئے چیلنجوں کا سامنا کر
کے لیے اپنے شعور کا استعمال کرسکتے ہوں۔ ہمیں ایسی تعلیم
کی ضرورت ہے جو ہمدردی اور مساوات پر یقین رکھ
والے شہری پیدا کرسکے۔"

عظیم پریم جی، چیئرمین وپر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

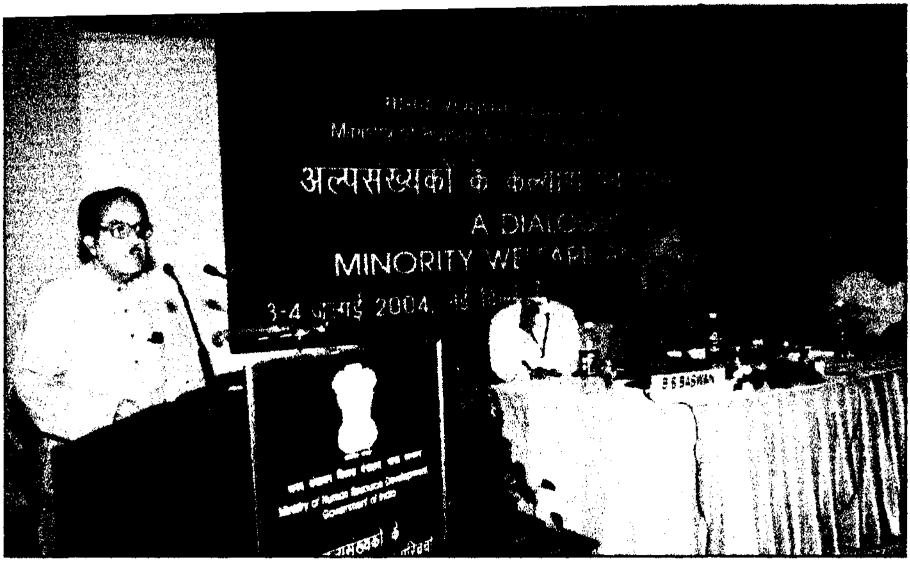

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومتِ ہند کی جانب سے اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیمی ترقی سے متعلق صلاح و مشورہ کرنے اور ایک بہتر لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے 3 اور 4 رجولائی 2004 کو بالترتیب وگیان بھون اور سمراٹ ہوٹل میں "اقلیتی فلاح و بہبود اور تعلیم" کے زیر عنوان ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس ۔ر ..... ر سے ماہرین تعلیم، اسکالرز، دانشوران اور مختلف سیاسی شخصیات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) جناب محمد علی اشرف فاطمی (وزیر مملکت وزارت ترقی انسانی وسائل)، جناب ارجن سنگھ (مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل)، ڈاکٹر رفیق زکریا، جناب بی. ایس. باسوان (ایجوکیشن سکریٹری) اور مائک پر پروفیسر سیف الدین سوز (ممبر پارلیمنٹ)۔

اسی موقعے پر لی گئی تصویر میں جناب جاوید اختر، جناب موسیٰ رضا اور جناب خورشید عالم خاں۔

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد-6، شمارہ-9 ستمبر 2004

مدیر: ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

معاون مدیر: فیروز عالم

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلا تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: قومی اُردو کونسل

مطبع: جے کے آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی 6

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اُردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
غیر ممالک کے لیے
10 امریکی ڈالر، سالانہ (بحری ڈاک سے)
15 امریکی ڈالر، سالانہ (ہوائی ڈاک سے)

چیک یا ڈرافٹ NCPUL کے نام روانہ کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک-1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی -066 110
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون:26109746

شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجدیار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات .... خطوط 2
ہماری بات .... اداریہ 5
● اسلام اور جدید سائنس کی ہم آہنگی (گیسٹ کالم) .... جاوید اقبال 6
● آپریشن بلیک بورڈ .... صوفیہ بتو 8
● اردو زبان میں تاریخ نویسی کی روایت .... امتیاز احمد 10
● ادبِ اطفال کی تدریس .... خالد سعید 13
● وہ ہمیں سکھا سکتے ہیں .... چھما شرما 15

گوشۂ ادب:
● اکبر الٰہ آبادی: نئی تہذیبی ریاست اور بدلتے ہوئے اقدار .... شمس الرحمٰن فاروقی 17
● ایک اور دوست راہیِ ملکِ عدم ہوا (بیادِ جگن ناتھ آزاد) .... رفعت سروش 26
● ''میں کیا میری حیات کیا'' کے امتیازات .... ابوالکلام قاسمی 30
● غضنفر سے گفتگو (انٹرویو) .... صفدر امام قادری 33

گوشۂ فروغ کتب
● گاؤں میں تعلیم کا رول (''تعلیمی تشکیل نو کے مسائل'' سے اقتباس) .... خواجہ غلام السیدین 36
● ترسیل و ابلاغ اور سماجی تبدیلی
(''عوامی ذرائع ابلاغ، ترسیل اور تعمیر و ترقی'' سے اقتباس) .... دیوندر اسّر 39

طلبہ کے لیے
● انٹرنیٹ کے ذریعے عالمی کیریئر (کیریئر گائیڈنس) .... سلمان عابد 42
● فرنٹ پیج شروع کرنا .... شفقت علی 54
● علمِ نباتات (کوئز) .... محمد اخلاق آزاد 58
● بڑھتے قدم (کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو-14) .... اقبال احمد 61

اُردو خبرنامہ .... ادارہ 62

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 72
● تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر/ ڈاکٹر سلامت اللہ .... مبصر: ریاض الدین
● اردو کے ادبی معرکے/ ڈاکٹر محمد یعقوب عامر .... مبصر: محمد ہادی رہبر
● فکر و تحقیق (شمارہ جولائی تا ستمبر 2004) .... مبصر: رئیس احمد
● عمر گزشتہ کا حساب/ مخمور سعیدی .... مبصر: فیروز عالم
● اسلحے، چھلّے اور ڈاک ٹکٹ میں اسلامیات/ واحد نظیر .... مبصر: شگفتہ یاسمین

بچوں کا گوشہ
● ہُد ہُد سے کوّے کا حسد (''مولانا روم کی کہانیاں'' سے اقتباس) .... محمد حفیظ الدین 80

آپ کی بات

■ **شاغل ادیب، 1-4-304/9/3،**
زیب منزل، مشیرآباد، حیدرآباد

''اردو دنیا'' ہر ماہ پابندی سے مل رہا ہے۔ زیرِ نظر شمارے (جولائی 2004) میں آپ کا اداریہ خوب ہے۔ آپ نے سی بی ایس ای کے دسویں اور بارھویں کے امتحانات کا جائزہ بالخصوص مرکز اور شمالی ہند کے مدارس اور طلبہ و طالبات کو بنیاد بنا کر لکھا ہے۔ لیکن سارے ہندستان اور اس کی تمام ریاستوں کا حال بھی یہی ہے کہ ان دنوں لڑکیاں، لڑکوں پر سبقت حاصل کر رہی ہیں۔ دو دن پہلے یہاں کے اخبارات میں یہ خبر پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی کہ ناگپور میں ایک رکشا والے کی بیٹی نے M.B.B.S. میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ لڑکوں کے بالمقابل لڑکیوں کی تعلیم کے تئیں دلچسپی اور کامیابی میں ان کی ماؤں کا رول واقعی قابلِ تحسین ہوتا ہے۔ وہ خود بھی بڑے نظم و ضبط کے ساتھ اپنے گھر سنسار کی ساری ذمے داریاں سنبھالتی ہیں اور لڑکیوں کو بھی پُرخلوص انداز میں اپنی تعلیم کی جانب رجوع کرنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ زیرِ نظر شمارے کے سبھی مضامین آپ کے حسنِ انتخاب و کمالِ ادارت کی داد دیتے ہیں۔ مطالعے کے بعد قارئین تذبذب کا شکار ہو جاتے ہیں کہ کسے زیادہ پسند کریں اور کسے کم۔

■ **ابرار اعظمی، سابق صدر شعبہ تربیت اساتذہ، خالص پور، اعظم گڑھ، یوپی**

''اردو دنیا'' کے جولائی کے شمارے میں آپ کا اداریہ اس تحریر کا محرک ہے۔ اس سال، سی بی ایس ای کے دسویں اور بارھویں درجات کے نتائج کا آپ نے بڑے سلیقے سے جائزہ لیا ہے اور بعض مفید نتائج بھی اخذ کیے ہیں۔ مثلاً مہنگے پبلک اسکولوں پر سرکاری اسکولوں نے بازی ماری اور لڑکوں پر لڑکیوں نے فوقیت حاصل کی۔ محدود سہولیات والے اسکول بھی بہتر انتظام و انصرام کی بنا پر اچھے نتائج دے سکتے ہیں۔ دیہی علاقوں کے طلبہ، مشکل حالات کے باوجود آگے آرہے ہیں۔ راجدھانی دہلی کے سرکاری اور امداد یافتہ اسکولوں کے طلبہ نے 77.82 فیصد کامیابی حاصل کی۔ مگر دہلی کے اردو میڈیم اسکولوں کو آپ نظرانداز کر گئے۔ سہ روزہ ''دعوت'' دہلی کی 22 جون کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ ''اردو میڈیم اسکولوں کے مایوس کن نتائج''۔ صاحب مضمون لکھتے ہیں:

''سی بی ایس ای کے دسویں اور بارھویں کلاس کے نتائج کے اعلان کے ساتھ اردو میڈیم اسکولوں کی حالتِ زار کا ماتم شروع ہو گیا ہے۔ ان اسکولوں میں ہمیشہ کی طرح اس بار بھی دسویں میں 28 فیصد اور بارھویں میں 24 فیصد طلبہ پاس ہوئے اور زینت محل گرلز سیکنڈری اسکول کی صرف 7.5 فیصد طالبات پاس ہوئیں۔''

بلاشبہ، آپ کی رہنمائی میں قومی اردو کونسل بہت سارے کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہے۔ آپ کے ذہن میں اردو زبان کے فروغ کا عزم و حوصلہ ہے، وسائل بھی بہم ہیں، تو کم از کم دہلی میں اردو میڈیم اسکولوں کی حالتِ زار پر توجہ دیں۔ اس سے اردو زبان کا بھی بھلا ہوگا اور مجموعی نتائج بھی دوررس اور ہمہ گیر ہوں گے۔

■ **بی آر چوہان، ایڈیٹر ''اسپین''، امریکن سینٹر،**
24 کستوربا گاندھی مارگ، نئی دہلی

''اسپین'' کے اردو ایڈیشن سے متعلق آپ نے جو اظہار خیال کیا ہے، اس کے لیے ہم آپ کے شکرگزار ہیں۔ ہم آپ کی رائے کی قدر کرتے ہیں اور یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ محسوس کرتے ہیں کہ ''اسپین'' کا معیار بہتر ہو رہا ہے۔ ابتدائی کچھ شمارے اردو ایڈیٹر کی عدم موجودگی میں خام تھے۔ اب ہمیں امید ہے کہ انجم نعیم صاحب کی گائیڈنس میں رسالہ مزید بہتر ہوگا۔ برائے کرم مستقبل میں بھی اپنے مشوروں سے نوازتے رہیں۔ قارئین کی رائے ہمارے لیے اہم ہے۔

■ **پران کیلا، پوسٹ بکس-5235، چانکیہ پوری پوسٹ آفس، نئی دہلی**

''اردو دنیا'' بہت دلچسپ رسالہ ہے۔ میں اسے ادبی ڈائجسٹ سمجھتا ہوں۔ جتنی معلومات اس میں ملتی ہیں، وہ کسی اور رسالے میں نہیں ملتیں۔ اس کا کینوس بہت وسیع ہے۔ یہ سب آپ لوگوں کی (جو اس سے وابستہ ہیں) محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔

■ **ابرار رحمانی، ایڈیٹر ''یوجنا'' اردو، A-538، یوجنا بھون،**
پارلیمنٹ اسٹریٹ، نئی دہلی

''اردو دنیا'' کا ہر شمارہ نئی آب و تاب لیے مفید و کارآمد مضامین کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ پچھلے دو شماروں (جولائی اور اگست) میں دو قسطوں میں مخمور سعیدی صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے۔ مخمور صاحب نے انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ اپنے مضمون میں ''آزادی کے بعد اردو کی ادبی صحافت — دلّی میں'' کا احاطہ کیا ہے۔ ظاہر ہے اتنے بڑے موضوع پر لکھتے ہوئے کچھ نہ کچھ چھوٹ جانے کا خدشہ ہمیشہ لاحق رہتا ہے۔

مخمور سعیدی صاحب کے مقالے میں سہ ماہی ''پیش رو'' کا ذکر چھوٹ گیا ہے۔ ''پیش رو'' 1988 سے 1990 تک شائع ہوا اور اس کے کل آٹھ شمارے منظرِ عام پر آئے۔ مجلسِ ادارت میں راقم الحروف کے علاوہ انور پاشا، مظہر مہدی (دونوں جے این یو میں استاد) ابواللیث شمسی (شیرگھاٹی کالج، بہار میں استاد)

شریف احمد قریشی (رامپور رضا کالج میں استاد) اور توحید خاں (نیوز سروس، آل انڈیا ریڈیو) شامل تھے۔ یہ بھی اس وقت جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر تھے، چنانچہ رسالے میں جے این یو کا مزاج صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ رسالے میں سیاسی، سماجی، تعلیمی مضامین کے علاوہ ادبی مضامین بھی شائع ہوتے تھے۔ اس رسالے میں پاکستان اور ہندستان کی ادبی صورت حال پر الگ الگ مضامین شائع ہوتے تھے۔

■ مست حفیظ رحمانی، جنرل سکریٹری بزم اردو، سیتاپور، یوپی

ماہ جولائی کا ''اردو دنیا'' نظر نواز ہوا۔ یہ رسالہ نہ صرف اردو حلقوں میں مقبول ہو رہا ہے بلکہ اردو کے سلسلے میں تمام معلومات بھی فراہم کر رہا ہے جس سے اردو زبان کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو صرف زبان ہی نہیں ہندستانی تہذیب کا آئینہ بھی ہے اس لیے ہر ہندستانی کی ذمے داری ہے کہ وہ اس کے فروغ میں تعاون کرے۔ اردو زبان اپنے ہی رسم خط میں زندہ رہے گی پھر بھی ''اردو درپن'' کا اجرا بھی ایک اچھا کام ہے۔ اس شمارے میں ''اردو کی تہذیبی معنویت''، ''آزادی کے بعد اردو صحافت دلّی میں'' اچھے مضامین ہیں اور احمد فراز کا انٹرویو بھی قابلِ قدر ہے۔

■ جہاں صبور سندی، سکریٹری نیپال اردو یوتھ کلب، بھرت مانہ پر لیند، کرشنا نگر، کپل وستو (نیپال)

کرشنا نگر نیپال میں قائم ''نیپال اردو یوتھ کلب'' اپنی نوعیت کا پہلا کلب ہے۔ ڈھائی کروڑ کی آبادی میں تقریباً 25 لاکھ افراد اردو بولتے، سمجھتے اور ان میں اکثر پڑھتے بھی ہیں۔ حکومتی سطح پر زبان کا مسئلہ آیا ہو یا مردم شماری کی بات ہو، اس کلب نے زبان کے خانے میں اردو لکھوانے کی مہم چلائی تھی۔ آج 101 زبانیں بولے جانے والے اس ملک میں اردو کو دسواں مقام حاصل ہے۔ جناب زاہد آزاد کی سرپرستی میں ہمارے کچھ ساتھی نیپالی معاشرے میں اردو کو پروان چڑھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔

کا بیان بھی۔ موصوف نے کہا ہے کہ ''حکومت اردو زبان کو فروغ دینے کی ہر ممکن کوشش کرے گی۔ اقلیتی فرقوں میں جدید اور تکنیکی تعلیم کے پھیلاؤ کے لیے بھی اقدامات کیے جائیں گے۔ نیز ایک قومی کمیشن بھی قائم کیا جائے گا۔'' خدا کرے یہ سب باتیں سچ ہوں۔

''مریخ پر زندگی'' ایک عمدہ معلوماتی مضمون ہے۔ حکیم اشہر قدیر کا مضمون اگرچہ مختصر ہے مگر تمام لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ محمد مجیب کا مضمون جو ان کی کتاب ''ہندستانی مسلمان'' سے ماخوذ ہے۔ پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مسلمان کس طرح سے الگ الگ فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

■ فیروز احمد فیض، سکریٹری جمعیۃ المسلمین لائبریری، محسن پورہ، مئوناتھ بھنجن

جولائی کا ''اردو دنیا'' دستیاب ہوا۔ سارے مضامین کو پڑھنے کے بعد دل کہہ اٹھا کہ واہ کیا رسالہ ہے۔ رسالے کو دیکھ کر آپ اور تمام اسٹاف کی محنت اور لگن کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ''اردو دنیا'' جب تک میری پہنچ سے باہر تھا، میں اردو کے متعلق بہت مایوس تھا، اور مجھے لگتا تھا کہ آج کے دور میں اردو صرف مدرسے تک ہی محدود ہے۔ مگر آپ کی سرگرمیاں دیکھ کر اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو آج بھی زندہ ہے، اور اردو بولنے والوں کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ جس طرح ہندی اور انگریزی والوں کے لیے روزگار کے مواقع ہیں اسی طرح اردو بولنے والوں کے لیے بھی روزگار کے مواقع موجود ہیں، جنھیں حاصل کرنے کے لیے صرف ہمت کی ضرورت ہے۔ اللہ سے دعا گو ہوں کہ آپ کے ارادے کامیاب ہوں اور آپ کی ہمت اور لگن میں مزید اضافہ ہو۔

■ انوار انصاری، سابق سینئر آڈٹ آفیسر، اولڈ ہزاری باغ روڈ، اپوزٹ چنا بھٹہ، شانتی نگر، رانچی۔ 834001 (جھارکھنڈ)

جولائی کے سرورق پر عزت مآب ارجن سنگھ کی تصویر شائع ہوئی ہے اور ان

بچوں کا گوشہ عمدہ ہے۔ ''جگنو'' پڑھ کر حیرت ہوتی ہے اور خدا کی قدرتِ کاملہ پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ ''اردو دنیا'' ہر گھر کے لیے ضروری ہے۔ اس کے لیے مہم چلانے کی ضرورت ہے۔ فیروز عالم معاون مدیر کا کام انجام دینے لگے ہیں۔ ان کو بہت بہت مبارکباد۔

■ رضوان خاں، سکریٹری بزمِ اردو، شیخ سرائے، ضلع سیتاپور، یوپی

''اردو دنیا'' شمارہ اگست 2004 باصرہ نواز ہوا۔ سرِ ورق پر وزیرِ اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ کے بیانات دیکھ کر نہایت مسرت ہوئی۔ وزیرِ اعظم ہند کا یہ کہنا کہ اقلیتوں کے امپاورمنٹ اور ان کی تعلیم پر منظم طور پر توجہ دی جائے گی اور ان کا یہ کہنا کہ اردو سے انھیں ذاتی لگاؤ ہے، ہر محبِ وطن اور محبِ اردو کے لیے پیامِ مسرت ہے۔ وزیرِ اعظم ہند اقلیتوں اور اردو کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیں گے، ایسی توقع ہم سبھی کو ہے۔ اللہ ان کے نیک ارادوں میں انھیں کامیابی عطا فرمائے (آمین)۔ اداریہ حسبِ معمول عمدہ ہے۔ اس کے علاوہ گوشۂ ادب کے تحت اکبر الٰہ آبادی پر مضمون بھی پسند آیا۔ دیگر مضامین اور مستقل کالم بھی اہم ہیں۔

■ رخشاں ہاشمی، محلہ، دلاور پور، مونگیر، بہار۔ 811201

''اردو دنیا'' کا شمارہ مئی 2004 پہلی بار پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ بعدِ مطالعہ طبیعت خوش ہوگئی۔ اب انشاء اللہ ہر ماہ نہایت ہی پابندی سے مطالعہ کیا کروں گی۔ واقعی بہت ہی معیاری اور بے مثال رسالہ ہے۔ سبھی مشمولات قابلِ ستائش ہیں۔ ''گوشۂ ادب'' میں مشہور مصنفہ امریتا پریتم کا انٹرویو دل میں اترتا چلا گیا۔ ان کے خیالات بے حد پسند آئے۔ ساتھ ہی ان کا افسانہ ''دامن میں پڑی

خاموشی کے سائے'' دل پر گہرے نقوش چھوڑ گیا۔ اردو ادب کی خدمت آپ جس دیانت داری سے کر رہے ہیں، وہ لائق تحسین ہے۔

■ **شکیل شاغل، سکریٹری انجمن ترقی اردو چکیا، وارڈ نمبر -9، کوآواں، باراچکیا، مشرقی چمپارن، بہار**

''اردو دنیا'' عالمی شہرت اختیار کر چکا ہے اور اس کے مضامین نے اردو طلبہ کے لیے ترقی کے دروازے وا کیے ہیں اور ان کے اندر ایک نئی روشنی اور نیا جوش پیدا کیا ہے۔ اس کے لیے میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کو انجمن ترقی اردو چکیا، مشرقی چمپارن کی جانب سے خصوصی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ''اردو دنیا'' کے توسط سے فروغ انسانی وسائل کے وزیر جناب ارجن سنگھ سے میری چند گزارشات ہیں۔ متحدہ ترقی پسند محاذ نے اردو کے تئیں جس خلوص اور جذبے کا اظہار کیا ہے اس سے اردو داں بالخصوص مسلمان کانگریس کے کافی قریب ہوئے ہیں۔ عزت مآب ارجن سنگھ سے میری گزارشات مندرجۂ ذیل ہیں۔

1. جس طرح حکومت گزٹ کو ہندی اور انگریزی میں شائع کرتی ہے اسی طرح اسے اردو میں شائع کیا جائے۔
2. ہندستان میں ہونے والے تمام انتخابات میں ووٹر لسٹ اردو میں شائع کی جائے۔
3. سی بی ایس ای، نوودے ودیالیہ، نیتر ہاٹ اور سینک اسکولوں میں اردو کو لازمی سبجیکٹ قرار دیا جائے۔
4. NET میں شامل ہونے والے اردو اسٹوڈنٹس سے اردو کے متعلق ہی سوالات پوچھے جائیں اور انھیں حساب، علم کیمیا اور علم طبیعیات کے سوالات سے مستثنیٰ رکھا جائے کیونکہ اردو ادب پڑھنے والے طلبہ ان موضوعات اور ٹیکنکس میں دل چسپی نہیں رکھتے۔ اس لیے جبراً انھیں یہ پڑھنا پڑتا ہے، نتیجتاً وہ ناکام ہو جاتے ہیں اور ان کی اردو کی صلاحیت برباد ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی ادب کے طلبہ سے سائنس کے سوالات مضحکہ خیز ہیں۔ اس ضمن میں سنجیدگی سے غور کر کے کارروائی کی جائے۔
5. تمام وزارتوں میں اردو سیل قائم کیا جائے اور اردو کی درخواستوں پر فوری کارروائی کی جائے۔
6. ڈاک خانوں، بینکوں اور ریلوے میں اردو میں درخواست دینے کی سہولت فراہم کی جائے۔
7. فوج اور تمام محکموں میں آبادی کے تناسب سے اردو کوٹا مقرر کیا جائے۔
8. اردو میں درسی کتابوں کی بروقت فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔
9. ٹیکنکل تعلیم کا انتظام اردو میں کیا جائے۔
10. ایوان بالا اور ایوان زیریں کی کارروائیاں اردو میں محفوظ کی جائیں اور اردو عوام تک پہنچائی جائیں۔
11. مرکزی مدرسہ بورڈ کا قیام جلد کیا جائے اور اس سے تمام چھوٹے بڑے مدارس کو ملحق کر کے ان کے اساتذہ اور ملازمین کو پانچویں پے کمیشن کے ضابطوں کے مطابق تنخواہ کی ادائیگی کی جائے۔

■ **انفعال عاقل، کاشانۂ حسین، 72، مسلمان پاڑہ روڈ، پوسٹ بکس گرولیہ، (ویسٹ بنگال)-743133**

''اردو دنیا'' متواتر مل رہا ہے۔ جون کا شمارہ پیش نظر ہے۔ الیکشن کے پس منظر میں لکھا گیا اداریہ فکر انگیز ہے۔ آپ کا کہنا کہ ''امید کہ نئی حکومت کے قیام کے بعد اردو زبان اور تعلیم کی ترویج و ترقی میں مزید تیزی آئے گی اور اردو والوں کو روزگار کے نئے مواقع حاصل ہوں گے۔'' اس طرف حکومت کی توجہ مبذول ہوگی تو اردو کا مستقبل مستحکم ہو جائے گا۔ آپ کی فعال شخصیت نے جریدے کو ادب، سیاست اور سائنس کی بازیافت کی راہ دکھائی ہے اور تنقیدی رجحان نیز ادب کے افہام و تفہیم کا آئینہ دار بنا دیا ہے۔ اس کی دلیل جون کے رسالے کے مشمولات خصوصاً احمد سجاد، وی لکشمی کمارن، شمس الرحمن فاروقی اور ابرار رحمانی کی تحریریں ہیں۔ خدا ''اردو دنیا'' کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔

■ **ملک زادہ جاوید، ڈویژنل آفیسر یوپی مائناریٹی فائنانس اینڈ ڈیولپمنٹ کارپوریشن، نوئیڈا (یوپی)**

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' اگست 2004 نظر کے سامنے ہے جس میں خطوط کے کالم میں محمد یعقوب الرحمان کا خط آپ نے شائع کیا ہے جس میں موصوف نے میرے مضمون ''امیر آغا— ایک تاثر'' پر لکھا ہے کہ ''ملک زادہ جاوید نے امیر آغا قزلباش مرحوم کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے وہ اگر سچ بھی ہے تو اسے پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مغربی کلچر میں اس قسم کی داستانیں ممکن ہے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہوں، ہماری تہذیب میں ان کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

سچ تو سچ ہی ہوتا ہے جھوٹ میں نمک مرچ لگا کر گھٹایا یا بڑھایا جا سکتا ہے مگر یہ کام ''سچ'' میں نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا کی مختلف زبانوں کے ادیبوں، شاعروں کے محاسن کا ذکر جہاں ان پر لکھنے والوں نے کیا ہے وہیں ان کی کچھ ایسی عادتوں کا بھی بیان ملتا ہے جو کہ معیوب سمجھی جاتی ہیں۔ اردو میں بھی درجنوں ادبا و شعرا کے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ غالب سے فیض تک نظر ڈالیے، کچھ اندازہ ہو جائے گا۔

امیر آغا پر میرے مضمون کا ایک ایک حرف سچ پر مبنی ہے جو لوگ امیر آغا سے مل چکے ہیں، وہ میری بات کی تائید کریں گے۔ بلاشبہ امیر آغا ایک اچھا انسان اور ایک اچھا شاعر تھا مگر مذہبی نقطۂ نگاہ سے اس میں کچھ خامیاں بھی تھیں جن پر پردہ ڈالنا اس کی شخصیت پر پردہ ڈالنا ہوگا۔ □□□

ہماری بات

اردو ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب اور مشترکہ کلچر کی زائیدہ و پروردہ زبان ہے جسے اس ملک کی سب سے بڑی لنگوا فرینکا ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس زبان کی ترویج وترقی میں ملک کے ہر طبقے اور ہر مذہب کے پیروؤں کا نمایاں رول رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کا کیرکٹر بھی سیکولر ہے۔ تقسیم ملک کے بعد اس کے سیکولر کردار پر شک کیا جانے لگا اور عوام کو اردو سے متعلق گمراہ کرنے کی سازشیں بھی رچی گئیں۔ حد تو یہ تھی کہ جدوجہد آزادی میں سب سے اہم کردار نبھانے والی اور ''انقلاب زندہ باد'' کا نعرہ دینے والی اردو زبان تقسیم ملک کی قصوروار قرار دی گئی اور یوں معتوب ٹھہری۔ بھلا ہو ان اردو دوستوں کا جن میں ہندو بھی تھے، مسلمان بھی اور سکھ بھی کہ انھوں نے اردو پر لگائے جانے والے الزامات کی تردید کی، ساتھ ہی ساتھ اردو میں مسلسل لکھتے پڑھتے بھی رہے اور دوسروں کو اس کی ترغیب دی اور اس طرح اس زبان کو اس نازک دور سے نکال لائے۔

آزادی کے بعد پچھلے پچاس پچپن برسوں میں آہستہ آہستہ اردو کے تئیں عوامی رویے میں بدلاؤ آیا ہے اور اس زبان کی اہمیت کے پیش نظر زندگی کے ہر شعبے میں اس کی ضرورت وافادیت محسوس کی جانے لگی ہے۔ میڈیا خصوصاً فلم اور ٹیلی ویژن میڈیا میں اپنی شیرینی اور اثر آفرینی کے باعث اردو کی طوطی بولتی ہے۔ اداکار اور اداکارائیں ہوں یا گلوکار، اس وقت تک اپنا تاثر چھوڑنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے جب تک کہ ان کا تلفظ بہتر نہ ہو جائے اور تلفظ بہتر بنانے کے لیے اردو سے بہتر کوئی دوسری زبان اس ملک میں نہیں ہے۔ اردو کی اس خوبی نے اسے روزگار سے جوڑنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور آج اردو والوں کی ایک بڑی تعداد فلم اور ٹی وی میڈیا میں اسکرپٹ رائٹنگ، نغمہ نگاری، لینگویج سپر وائزر اور دیگر بہت سے مواقع حاصل کر رہی ہے۔

قومی اردو کونسل نے اپنے قیام کے فوراً بعد ہی اردو کی ترویج وترقی کا جو لائحۂ عمل تیار کیا اس میں اس کے سیکولر کیرکٹر کو نمایاں کرنے کی کوشش کی اور اسے گنگا جمنی تہذیب کی علم بردار کے طور پر ملک کے طول وعرض میں مقبول بنانے کی کوشش کی۔ کونسل کی کوشش تھی کہ لوگوں کے ذہن میں جو یہ غلط خیال گھر کر گیا ہے کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اس کا سدِّ باب کیا جائے تاکہ اس کی اصل شبیہ ابھر کر سامنے آسکے۔ اس کے لیے کونسل نے منصوبہ بند طریقے سے کوششیں کیں اور مقام مسرت ہے کہ ہمیں اس میں کامیابی نصیب ہوئی۔ کونسل نے نہ صرف کمپیوٹر ایپلی کیشن اور ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کورس شروع کر کے اردو داں طبقے کے طلبہ وطالبات کی روزگار مرکوز تربیت شروع کی بلکہ اردو سکھانے کا ششماہی مراسلاتی سرٹیفکیٹ کورس بھی شروع کیا تاکہ ان لوگوں کو اردو رسم خط سے واقف کرایا جاسکے جو اس سے نابلد ہیں اور دوسری زبانوں کے ذریعے اس کا شعروادب پڑھتے ہیں۔ اس کورس کو کافی پذیرائی حاصل ہوئی اور غیر مسلم حضرات نے بھی اس کورس میں بڑی تعداد میں داخلے لیے۔ اس تجربے سے تحریک پاکر کونسل نے اس کورس کو ایک سالہ ڈپلوما کورس میں اپ گریڈ کر دیا جس کے پہلے ہی سیشن میں 11 ہزار افراد نے داخلے لیے۔

کونسل نے اردو زبان کو ملک کے ہر گوشے اور ہر خطے تک پہنچانے کی اس مہم میں مزید تیزی لاتے ہوئے حال ہی میں ملک کے 19 صوبوں میں 107 اردو اسٹڈی سینٹر قائم کیے ہیں جن میں کنٹیکٹ کلاسیز کی سہولت بھی موجود ہے تاکہ طالب علموں کو زبان سیکھنے میں آسانی ہو۔ اب تک 80 اسٹڈی سینٹروں کے فارم موصول ہوئے ہیں جن کے طلبہ کی مجموعی تعداد 4500 ہے۔ انھیں ملا کر کونسل کی طرف سے چلائے جانے والے ایک سالہ اردو ڈپلوما کورس کے طالب علموں کی مجموعی تعداد 15000 ہوگئی ہے۔ اردو سیکھنے والوں کی اس فہرست میں فوج اور پولیس کے اعلا افسران، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے وکلا، آئی اے ایس افسران، یونیورسٹیوں کے اساتذہ، ڈاکٹرز اور انجینئر حضرات کی تعداد خاصی ہے۔ ان شائقین اردو کا تعلق ہر مذہب، پیشے، عمر اور طبقے سے ہے۔

کونسل نے اردو کو ہر طبقے اور ہر مذہب کے لوگوں سے پھر سے جوڑ کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے، یہ ہر ہندستانی کی زبان ہے اور اس کی خاطر خواہ ترقی اسی وقت ممکن ہے جب تمام ہندستانیوں میں اسے قبول عام حاصل ہو جائے۔ اردو کسی مخصوص مذہب یا فرقے کی نہیں، ہم سب کی مشترکہ میراث ہے۔ جس طرح اجنتا، ایلورا اور تاج محل ہماری مشترکہ میراث ہیں اسی طرح ہندستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانیں بھی ہندستان کی سنسکرتی کا اٹوٹ حصہ اور ہماری مشترکہ وراثت ہیں۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ اردو کی طرف عوامی رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔ آزادی کے بعد چالیس پینتالیس سال کے عرصے میں اردو کو جس طرح مسلمانوں کی زبان بنا دیا گیا تھا وہ رویہ اب ختم ہو رہا ہے اور اردو اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر رہی ہے۔ گزشتہ دنوں لکھنؤ میں قومی اردو کونسل کے اسٹڈی سینٹر کا افتتاح کرتے ہوئے ممتاز عالم دین جناب کلب صادق نے بھی اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ اردو کسی ایک قوم یا ایک مذہب کی زبان ہے۔ یہ مسلمانوں کی نہیں تمام ہندستانیوں کی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی تعداد میں غیر مسلم حضرات بھی اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔'' ابھی حال ہی میں انجمن ترقی اردو (گوالیار) نے اردو سکھانے کا Summer Course Programme 17 مئی سے 17 رجولائی تک چلایا جس میں رٹائرڈ پرنسپل اور دیگر سرکاری وغیر سرکاری غیر مسلم ملازمین نے بھی ذوق وشوق سے حصہ لیا اور اردو سیکھی۔

اردو ایک زندہ زبان ہے اور اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیروں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کونسل کے علاوہ دیگر ادارے، انجمنیں اور رضاکار تنظیمیں اردو کو ان افراد سے جوڑنے کی سرگرم کوششیں کریں جو کسی نہ کسی وجہ سے اب تک اردو سے جڑ نہیں پائے ہیں۔ اردو جاننے اور لکھنے پڑھنے والوں کا حلقہ جس قدر وسیع ہوگا اس کے حقوق کی بازیافت میں بھی اسی قدر آسانی ہوگی، اردو میں روزگار کے مزید مواقع پیدا ہوں گے اور اس کا مستقبل روشن تر ہوگا۔

جاوید اقبال

گیسٹ کالم

اسلام اور جدید سائنس کی ہم آہنگی

علامہ اقبال کے انگریزی خطبات "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" کو عام طور سے "چھ خطبات" یا "مدراس لیکچرز" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ 1929 میں دیے گئے ان لیکچرز میں مسلم فرقے کو درپیش عصری کشمکش سے متعلق اقبال کے خیالات کا واضح اظہار ملتا ہے کہ جدید تجربات کی روشنی میں اسلامی نظریات کی ازسرِنو تشریح کیسے کی جائے۔

اس عظیم فلسفی اور شاعر کا خیال تھا کہ اگرچہ ہندستانی مسلمان سیاسی طور پر اسلامی ممالک کی مدد نہیں کرسکتے مگر وہ فکر اور دانشوری کے میدانوں میں ایک فعال کردار ادا کرسکتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس منصوبے کا مرکزی نکتہ اسلامی سائنس کا احیا ہے۔ اسی کے ذریعے اسلام اور جدید سائنس کے درمیان ٹوٹے ہوئے رشتے کو دوبارہ جوڑا جاسکتا ہے اور اس طرح سے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدانوں میں مسلمانوں کی ترقی میں مدد کی جاسکتی ہے۔

یورپ کی سائنسی اور عقلی میراث سے استفادے کا مطلب کسی غیر اسلامی یا اجنبی علم کو اپنانا یا اس کی نقل کرنا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس یہ ان اقدار کو دوبارہ قبول کرنا ہے جو مسلمانوں نے اپنے عروج کے دنوں میں یورپ کو مستعار دی تھیں۔ اسی سائنٹفک ورثے پر مغرب نے نئے علوم اور نئی سائنس کی بنیاد رکھی جسے مسلمانوں نے خوابِ غفلت میں گنوادیا۔ اقبال کے خیال میں اسلامی علمِ کلام، جس کی جڑیں یونان کی قیاسی سائنسوں تک پہنچتی ہیں، اب ختم ہوگیا ہے اور اس کے ازسرِنو احیا کی ضرورت ہے۔

اقبال کی نظر میں ایک اور اہم مسئلہ اسلامی قوانین یا "فقہ" کی تشکیلِ نو کا تھا۔ ان کے خیال میں اسلامی قوانین کی تشریحِ نو صرف اجتہاد کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ لیکن مسلم دنیا اور خاص طور سے ہندستانی علما کی روایتی قدامت پسندی کی وجہ سے یہ ایک سنجیدہ اور خطرناک امکانات کا حامل مسئلہ بن گیا ہے۔ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی وجہ سے کچھ لوگ پہلے ہی اقبال پر کفر کا فتویٰ صادر کرچکے تھے۔ لیکن اقبال اجتہاد کے ایک نئے طریقۂ کار کے لیے اپنی تفتیش اور تحقیق کو جاری رکھنا چاہتے تھے جو بدلے ہوئے وقت کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق ہو۔

اپنے خطبات میں اقبال نے جدید سائنسی نظریات کی روشنی میں علمِ کلام کے مطالعے پر زور دیا ہے تاکہ اسلام کے پیروؤں کے عقائد کو اور مضبوط کیا جاسکے۔ ہوسکتا ہے کہ مذہبی علما ایسے مسلمانوں کو "مغرب پرست" کہیں، لیکن اقبال ایسے قدامت پسند بیانات سے قطعی متاثر نہیں تھے۔

علاوہ ازیں اقبال چاہتے تھے کہ اسلامی قانون یا "شریعت" پر جدید عہد کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق نظرِ ثانی کی جائے۔ ان کے خیال میں صرف مذہبی فرائض یا عبادات ہی کسی قسم کی تبدیلی سے ماورا ہیں کیونکہ وہ حقوق اللہ ہیں۔ لیکن دنیاوی معاملات حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں اور ان میں تبدیلی اور ترمیم کی گنجائش ہے۔ دراصل ان حقوق میں اجتہاد کے مسلسل عمل کے ذریعے ترمیم کرنا ضروری ہے تاکہ بدلتے وقت کی ضرورتوں کو پورا کیا جاسکے۔ ان کا مشورہ بالکل واضح تھا کہ مسلمانوں کو نیم خواندہ ملاؤں کو اپنے ناجائز استعمال کی اجازت نہیں دینی چاہیے۔ اقبال نے مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی کہ وہ دقیانوسی سیاسی و تہذیبی معاملات اور سنسنی خیز پریس ریلیزوں میں اپنا وقت نہ برباد کرکے سنجیدہ تحریریں پیش کریں۔

اقبال کی تعلیمات کی روشنی میں ہندستانی مسلمانوں کے درمیان جدید تعلیم کی اشاعت کیوں ممکن نہیں ہے؟ کیا مسلمانوں کے دینی مدارس کا سیکولر تعلیمی اداروں کے ساتھ انضمام نہیں ہوسکتا جیسا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ندوۃ العلما میں کیا گیا؟ اور کیا یہ ہماری تعلیمی زندگی میں وحدت کے اصول کی ایک حقیقی اور عملی تجسیم نہیں ہوگی۔ دینی مدارس کا درسِ نظامیہ، تعلیم کا ایک پرانا طریقۂ کار ہے۔ اس کا عبادات سے کچھ لینا دینا نہیں اور یہ خاص طور سے معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا ہم اسے عہدِ حاضر کی ضرورتوں کے مطابق تبدیل نہیں کرسکتے؟

مسلم پرسنل لا کے بہت سارے پہلو ایسے ہیں جن کی تشریحِ نو ضروری ہے۔ ماضی میں اس کے لیے دو طریقے اختیار کیے گئے۔ ایک تو عدلیہ کے ذریعے۔ مثال کے طور پر پاکستان میں عدالت نے طلاق کے برابر ہی 'خلع' کا بھی حق دیا جس کے ذریعے عورت شادی کا معاہدہ منسوخ کرنے کی حقدار ہوگئی اور دوسرا طریقہ قانون سازی کا ہے۔ علما اور ماہرین پر مشتمل ایک کمیشن بنایا جاسکتا ہے جو مختلف قانونی پیچیدگیوں کا جائزہ لے کر اپنی رائے پیش کرے جسے پرسنل لا کی اصلاحات کے لیے بنیاد بنایا جاسکے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ

● مقالہ نگار علامہ اقبال کے صاحبزادے اور پاکستان سپریم کورٹ کے جج ہیں۔

اقبال کے نظریات کا احیا ہندستان اور پاکستان دونوں جگہوں کے مسلمانوں کے لیے یکساں ضروری ہے، ہر چند کہ اس کی وجوہات مختلف ہیں۔ اگر اقبال کے خیالات کو واضح طور سے پیش کیا جاسکے تو مسلمانوں کی کثیر جماعت اس سے بے حد مستفید ہوسکتی ہے۔ اقبال کے ان لیکچرز کو مسلمانوں کی نئی نسل کے سامنے پیش کرنا ایک بہتر شروعات ہوگی۔ حالانکہ ان لیکچرز کی نشرواشاعت تقسیم سے قبل ہوئی تھی مگر ان کے پیچھے پوشیدہ مقصد ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنی افادیت رکھتا ہے کہ کس طرح سے مسلمان اپنی مذہبی شناخت کو قائم رکھتے ہوئے جدیدیت سے ہم آہنگ ہوسکتے ہیں۔

پاکستان کے قیام کے بعد ہندستانی مسلمانوں کی حیثیت ایک اقلیت کی ہوگئی لیکن وہ ایک ہندو اکثریت والے سماج میں دوسری اقلیتی جماعتوں میں سب سے بڑے ہیں۔ ہندستان کے سیاسی رہنما اس بات سے پوری طرح واقف ہیں کہ ہندستانی قوم کی وحدت اور سالمیت کے لیے سیکولرزم کی ترقی ناگزیر ہے۔ یہ کہنا شاید غلط نہیں ہوگا کہ اگر کچھ ہندستانی مسلمان آج اقتصادی طور پر خوش حال ہیں تو یہ پوری طرح سے ہندستانی سیکولرزم کی دین ہے۔ اس لیے ہندستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سیکولرزم کو بہتر شکل دینے میں اپنا مکمل تعاون پیش کریں۔ یہ رویّہ نہ صرف یہ کہ ان کی تہذیبی اور اقتصادی بقا کے لیے ضروری ہے بلکہ قوم پرستی اور حب الوطنی سے بھی موافقت رکھتا ہے۔

مترجم: فاخر شبیر عباسی

(بشکریہ "ٹائمز آف انڈیا" نئی دہلی، 17 رجون 2004)

□□□

دھوپ چولھا

مصنف: ایم۔ ایم۔ ہدیٰ / مترجم: ڈاکٹر خلیل اللہ خاں

توانائی کے بحران نے قدرتی وسائل کی طرف پھر سے انسان کی توجہ مرکوز کی ہے۔
دھوپ چولھا یا سولر کوکر کی ایجاد اس کی تازہ مثال ہے۔ اس کتاب میں دھوپ چولھا تیار کرنے
کے سلسلے میں کیے گئے مختلف تجربات اور ان کے نتائج کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔
کتاب میں دھوپ چولھا بنانے کا طریقہ اور کوکر میں مختلف کھانے پکانے کی ترکیبیں بھی بتائی گئی ہیں۔

صفحات: 100، قیمت -/38 روپے

کیمیا کی کہانی

مصنف: سید شہاب الدین دسنوی

انسان فطری طور پر تجسس پسند واقع ہوا ہے۔ کیا، کیوں اور کیسے وغیرہ سوالات انسان کے ذہن میں
ہمیشہ گونجتے رہے ہیں اور یہی سوالات مختلف ایجادات و انکشافات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔
"کیمیا کی کہانی" میں بعض اہم عناصر مثلاً آکسیجن، بجلی، سوڈا، کیلشیم، میگنیشیم
اور ریڈیم وغیرہ کی دریافت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔

صفحات: 128، قیمت: -/16 روپے

سائنس کی کہانیاں (حصہ اوّل)

مصنف: سکلف اور سکلف / مترجم: ڈاکٹر انیس الدین ملک

سائنس ہماری زندگی کا لازمی جزو ہے۔ اس کے بغیر موجودہ زندگی کا
تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ زیرِ نظر کتاب میں کہانیوں کی مدد سے
مختلف اشیا کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے اور ان سے متعلق
تمام جانکاری بھی دی گئی ہے۔

صفحات: 152، قیمت: 18 روپے

عرب کی لوک کہانیاں: ایک تہذیبی ورثہ

مصنف: ڈاکٹر حسن عسکری کاظمی

کسی بھی ملک اور معاشرے میں لوک ادب کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے ہم براہِ راست
اس ملک اور معاشرے کی تہذیب و ثقافت، رہن سہن، خورد و نوش، عادات و اطوار اور عقائد و توہمات سے
واقف ہوتے ہیں۔ لوک ادب ادبی تصنع، فنی قیود اور پابندیوں سے پاک ہوتا ہے۔
اس لیے یہ عوام سے نزدیک ہوتا ہے۔ اس کتاب میں 28 لوک کہانیاں شامل ہیں
جو عوامی لوک ادب کے ہر رنگ کی نمائندگی کرتی ہیں۔

صفحات: 131، قیمت: -/23 روپے

نورتن کہانیاں

مصنف: محمد بخش مہجور / انتخاب: شمیم احمد

محمد بخش مہجور کی کتاب "نورتن" قدیم ادب میں اہم مقام کی حامل ہے۔ نو ابواب پر مشتمل
اس کتاب میں دلچسپ انداز میں سبق آموز کہانیاں پیش کی گئی ہیں۔ زیرِ نظر انتخاب میں
بچوں کی ذہنی صلاحیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کہانیوں کی زبان سہل اور عام فہم بنا دی گئی ہے
تاکہ بچے انھیں بخوبی پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ ساتھ لطف اندوز بھی ہوسکیں۔

صفحات: 192، قیمت: -/20 روپے

ایک نائی اور رنگ ساز کا قصہ

مصنف: اطہر پرویز

داستانیں ہمارا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ یہ جہاں ایک طرف تفریحِ طبع کا ذریعہ ہیں وہیں
ان سے متعلقہ عہد کی جیتی جاگتی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مافوق الفطری عناصر کی
پیش کش سے قطعِ نظر داستانوں میں ہماری سماجی و ثقافتی تاریخ پوشیدہ ہے۔
اس کتاب میں ایسی ہی تین داستانیں شامل ہیں۔

صفحات: 148، قیمت -/18 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: صوفیہ تھو
مترجم: محمد توقیر عالم راہی

آپریشن بلیک بورڈ

س: تعلیم کی راہ میں کون سی دشواریاں ہیں؟

ج: ہمارا مروجہ نظامِ تعلیم دو سو سال پرانے تدریسی ماڈلوں پر مشتمل ہے۔ یہ نظام قصداً ایسے اشخاص پیدا کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا جو متون کو بخوبی حفظ کرسکیں اور انھیں جو بھی حکم دیا جائے وہ اس کی تعمیل کریں۔ یہ واضح طور پر انگریزی حکومت کا اثر ہے۔ مروجہ نظامِ تعلیم کی مکمل تعیینِ قدر کی ضرورت ہے۔ ہمارے بچوں کو کتابیں رٹنے کی بجائے اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ ''کس طرح زیادہ سیکھا جائے''۔ ہمیں ایسے اشخاص کی ضرورت ہے جو مفکر ہوں، علم و آگہی کے خالق ہوں، تخلیقی قوت رکھتے ہوں اور نئے چیلنجوں کا سامنا کرنے کے لیے اپنے شعور کا استعمال کرسکتے ہوں۔ ہمیں ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو ہمدردی اور مساوات پر یقین رکھنے والے شہری پیدا کرسکے۔

س: کیا آپ نصابِ تعلیم، کلاس روم مشق اور جانچ کے طریق کار پر نظرِثانی کی بات کررہے ہیں؟

ج: اسکول اور کلاس روم ''طفل مرکوز'' ہونا چاہیے۔ ہر اسکول اور ریاست کو اپنی ذمے داری قبول کرنی چاہیے اور اس سمت میں حصولیابیوں کے لیے شفافیت بہت ضروری ہے۔

میرا یقین ہے کہ تدریس سب سے بہترین پیشہ ہے۔ ہمارے ملک میں اس پیشے کو ہمیشہ عزت و وقار حاصل رہا ہے۔ بہت سارے اساتذہ ہیں جو نیک نیتی کے ساتھ اپنی ذمے داریوں کو پورا کررہے ہیں اور ذمے دار لوگ ہی حیرت انگیز خدمات انجام دیتے ہیں۔

س: کیا وجہ ہے کہ ہم بچّوں کو اچھی تعلیم مفت مہیا نہیں کرپارہے ہیں؟

ج: یقیناً، اس سمت میں ہمیں کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس مسئلے پر سرکاری و غیرسرکاری دونوں سطح پر کافی بیداری آئی ہے۔ جہاں رسائی اور کمیت کے اعتبار سے چیزوں میں بڑی تیزی کے ساتھ بہتری آرہی ہے وہیں معیار کو پسِ پشت ڈال دیا گیا ہے۔ تعلیم کو قومی ایجنڈے میں سرِفہرست رکھنے کے لیے ہر شہری کو آواز اٹھانا ہوگا۔

س: کارپوریٹ سیکٹر (Corporate Sector) کا تعاون کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے؟

ج: کارپوریٹ سیکٹر کو بڑھ چڑھ کر امداد کرنے نیز تعلیمی نظام کی تمام سطحوں پر شرکت کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ شرکت تین طریقوں سے ممکن ہوسکتی ہے:

☆ تعلیمی انتظامیہ کو نصاب سے متعلق معلومات فراہم کرانا تاکہ اس کی ضروریات کی تکمیل ہوسکے۔

☆ تعلیمی اداروں کو اپنی خدمات بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے مینجمنٹ ٹریننگ اور انتظامی امور میں ماہرانہ رائے دینا۔

☆ مالی امداد کرنا جہاں کہیں بھی ممکن ہوسکے۔

س: عظیم پریم جی فاؤنڈیشن کے تجربات کیسے ہیں؟

ج: فاؤنڈیشن کی بنیاد رکھنے کے دوران ہی ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہمارا عمل ترقی کے میدان میں ٹھوس اور بالکل نپا تلا ہونا چاہیے۔ ہمارے سارے پروگرام بیس لائنز (Base lines)، اینڈ لائنز (End lines) اور آزادانہ تحقیق پر مشتمل ہیں، جن سے ہمیں واضح طور پر اندازہ ہوجاتا ہے کہ ہمیں جو کچھ حاصل کرنا تھا اس میں کہاں تک کامیابی ملی۔ اہم بات یہ ہے کہ تمام مطالعے اور جانچ مکمل ہوجانے کے بعد ہمارے ویب سائٹ (website) پر عوام کے لیے پیش کردیے جاتے ہیں۔ ہم لوگ اس میدان میں تین برس سے بھی کم عرصے سے خدمات انجام دے رہے ہیں اور جو رجحان سامنے آیا، وہ بلاشبہ مثبت ہے۔

س: کیا کوئی خاص وجہ ہے کہ آپ تعلیم پر خصوصی توجہ دے رہے ہیں؟

● اسکولی تعلیم سے عظیم ہاشم پریم جی کو خصوصی دلچسپی ہے۔ ''عظیم پریم جی فاؤنڈیشن'' کی جانب سے اس کے لیے کئی اقدامات کیے گئے ہیں۔ مثلاً "Accelerated Learning Programme" جسے کرناٹک کی حکومت 6,000 اسکولوں میں استعمال کرنے جارہی ہے۔ ساتھ ہی دوسرا اقدام — "Applying thought in School" ہے۔ غالباً یہ اساتذہ کے امپاورمنٹ کے لیے پرائیویٹ طور پر سب سے بڑا اقدام ہے، جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہورہے ہیں۔ وپرو (wipro) کے چیئرمین عظیم پریم جی سے صوفیہ تھو کی گفتگو قارئین "اردو دنیا" کی نذر ہے۔

ج: تعلیم آدمی کو علم و آگہی بخشتی ہے اور اسے مساوات کا درس دیتی ہے۔ ملک اور انسانیت کی ترقی سے متعلق بیشتر موضوعات کا تعلق تعلیم اور سیکھنے کے عمل سے ہے۔ قوم کی تعمیر کا تعلق بھی علم سے ہے۔ تعلیم یافتہ لڑکیاں اپنے خاندانوں اور بچوں کی بہتر دیکھ ریکھ کو یقینی بناتی ہیں، چھوٹی فیملیوں کی قدروں کی پابند ہوتی ہیں، اور اپنے بچوں کو اعلا اقدار اور اچھے اخلاق کا درس دیتی ہیں۔

س: پچاس فیصد سے زیادہ بچے آٹھویں کلاس میں آنے سے قبل ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں، دوپہر کے کھانے کی اسکیم کے باوجود ہم انہیں اسکول میں لانے سے قاصر ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج: اصل مسئلہ غریبی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تعلیم کے ذریعے بچوں کو اسکول میں کچھ اہم اور عملی چیزیں سیکھنے کے قابل بنایا جائے۔ اس کے لیے چند مناسب اقدامات کیے گئے ہیں، مثلاً ''مڈ ڈے میل'' (Mid Day Meal)۔ ہمیں بہتر نتائج دکھانے کے لیے مزید وقت درکار ہوگا۔

س: اگر آپ وزیرِ تعلیم ہوتے تو تعلیمی ترقی کے لیے کیا اقدامات کرتے؟

ج: میرے نزدیک تعلیم کا مسئلہ بڑا ہی نازک ہے۔ محض یہی ایک راہ ہے جس کے ذریعے قومی کردار اور اقدار کی تعمیر و تشکیل ہوسکتی ہے۔ میں مختلف اقدامات کرنا چاہوں گا، مثلاً:

☆ بعض ماہرینِ تعلیم کو مامور کرنا جو مستقبل کے عالمی منظرنامے پر نظر رکھیں۔

☆ اہلیتوں کا جائزہ لینا، تاکہ موجودہ اور آنے والی نسلیں دستیاب مواقع اور وسائل سے قومی مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے استفادہ کرسکیں۔

☆ قومی بحث و مباحثے کے ذریعے نتیجے پر مبنی تعلیمی نظام کا قیام جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ ہمارے پاس پہلے سے ہی ''قومی تعلیمی پالیسی'' کے رہنما اصول موجود ہیں، جنھیں نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔

☆ ایک بار نصاب متعین کرلینے کے بعد اعلا پیمانے پر ٹیچر ایجوکیشن پروگرام کا آغاز کرنا جس کی توجہ ''بچوں کی تعلیم'' اور ملٹی گریڈ ٹیچنگ (Multigrade Teaching) پر ہو۔

☆ آزادانہ اور مسلسل جانچ کا سلسلہ قائم کرنا، جوکہ نہ صرف بچوں کے لیے ہو، بلکہ بیک وقت اسکول اور نظامِ تعلیم کے لیے بھی ہو۔

☆ تعلیم کو بہتر بنانے اور اس میں نیا پن لانے کے لیے تعلیمی اداروں اور پبلک/ پرائیویٹ تنظیموں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری کرنا۔

(بشکریہ ''ٹائمس آف انڈیا'' نئی دہلی 22 جولائی 2004) □□□

ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری

مصنف: پروفیسر گوپی چند نارنگ

یہ کتاب اس تاریخی سچائی کو مدلل اور پرزور انداز میں سامنے لاتی ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جس میں استخلاصِ وطن کی لڑائی پورے جوش و خروش کے ساتھ لڑی گئی اور جس کے نغموں اور نعروں نے دلوں کو وہ ولولہ اور دماغوں کو وہ بصیرت عطا کی جس کی قوم کو ضرورت تھی۔

صفحات: 600، قیمت: -/300 روپے

آندھی (منظرنامہ)

مصنف: گلزار

اردو زبان میں فلمی منظرنامہ ایک نئی صنف ادب ہے۔ اسے بصری پیکروں کا ایسا سلسلہ کہا جاسکتا ہے جو کہانی کا روپ دھارن کرلے۔ فلم ''آندھی'' کا یہ منظرنامہ کملیشور کے ناول ''کالی آندھی'' پر مبنی ہے اور اس کا اسکرین پلے، مکالمے اور گیت گلزار کے قلم سے ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ عمومی دلچسپی کا باعث بھی ہوگا لیکن اس کی اشاعت کا ایک مقصد ان طلبہ اور طالبات کی رہنمائی بھی ہے جو فلمی شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کے خواہش مند ہیں۔

صفحات: 122، قیمت: -/65 روپے

تاریخ اور سماجیات

مصنفہ: عائشہ بیگم

تاریخ اور سماجیات، علم کے دو مختلف گوشے ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ تاریخ کا سب سے قریبی تعلق سماجیات سے ہے کیونکہ دونوں کا موضوع انسان، اس کا طرزِ عمل اور کردار ہیں۔ انسانی کردار کی داستان اس کے اخلاق و عمل اور آپسی تعلقات کی داستان ہے اور اخلاق و عمل کا انحصار بڑی حد تک ماضی کے تجربات پر بھی ہوتا ہے۔۔۔ اس کتاب میں اس اہم بحث کو بڑی خوبی کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ طرزِ بیان استدلالی اور علمی ہے۔

صفحات: 140، قیمت: 51 روپے

جدید سیاسی فکر

مصنف: ڈاکٹر سید انوار الحق حقی، ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

اس کتاب میں جدید سیاسی فکر کے پس منظر کے ساتھ ساتھ ان تمام سیاسی فلسفوں پر گفتگو کی گئی ہے جنھوں نے اس مدت میں عالمی سیاست پر اثر ڈالا اور مختلف حکومتی نظاموں کی تشکیل یا استرداد دونوں کا موجب بنے۔ قدامت پسندی، افادہ پسندی، عینیت، ثنویت، قانونیت، اشتراکیت اور اس کے مختلف مکاتبِ فکر، سیاسی تکثیریت، مملکت مخالف نظریات، جمہوریت مخالف نظریات، مہاتما گاندھی کا عدم تشدد کا نظریہ اور سرودیہ تحریک — یہ کتاب ان تمام عنوانات پر سیر حاصل روشنی ڈالتی ہے۔

صفحات: 305، قیمت: -/120 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

امتیاز احمد

اردو زبان میں تاریخ نویسی کی روایت

کہا جاتا ہے کہ زندہ قومیں اپنے ماضی کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں اور اس سے سبق حاصل کرتی ہیں۔ یہی معاملہ زندہ زبانوں کا بھی ہے جو ماضی کی ترمیم و تفہیم کا مثبت ذریعہ بنتی ہیں۔ اس کی ایک عمدہ مثال 18 ویں صدی کے نصف آخر سے 20 ویں صدی کے نصف اوّل تک اردو زبان کے معاملے میں دیکھی جاسکتی ہے۔

تاریخ نویسی کا تعلق ان اصول و قواعد سے ہے جو کسی ملک یا قوم کی تاریخ کی ترتیب اور تفہیم میں معاون ہیں۔ اس میں مورخ کے ذاتی اور سماجی پس منظر، تاریخ نگاری کے مقاصد، ماٰخذ کے استعمال اور ان کی صحت کے تناظر میں تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ زمانہ قدیم سے ہی مختلف اقوام میں تاریخ نویسی کی روایات کو فروغ حاصل ہوتا رہا ہے مگر اس کے لیے مستند اصولوں کو وضع کرنے میں سب سے اہم حصہ عرب مورخوں کا رہا ہے۔

مسلم عربوں میں علم تاریخ کا آغاز مذہبی تقاضوں کے تحت ہوا اگرچہ اس میں ماقبل اسلام عہد کی روایتیں بھی معاون رہیں۔ ابتدائی تصنیفات میں سیرتیں، مغازی، انساب وغیرہ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ اس کے بعد تاریخ عالم اور تاریخ اقوام کی جانب توجہ دی گئی۔ دونوں ہی ادوار میں قواعد تاریخ نویسی کو خاص اہمیت دی گئی اور ماٰخذ کی تصدیق کے اصول وضع کیے گئے۔ ان قواعد و اصول کے مطابق، مختلف تاریخیں مرتب ہوئیں۔ الطبری نے تاریخ عالم تصنیف کی۔ ابن خلدون نے تاریخی عوامل کے مابین محرکات و اثرات کے باہمی تعلق کی تشریح پر زور دیا اور البیرونی نے اسلامی ممالک سے ہٹ کر ہندو مذہب اور علوم کے متعلق مستند تاریخ مرتب کی۔ ان مثالوں کو پیش کرنے کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے قبل ہی ان کے درمیان تاریخ نویسی کا فن کافی ترقی حاصل کرچکا تھا۔ اس کے اثرات ہندستان میں مسلم عہد حکومت میں واضح طور پر مرتب ہوئے۔

تاریخ کے طلبہ اب اس بات پر متفق ہیں کہ فن تاریخ نویسی کو مسلمانوں نے ہندستان میں رائج کیا۔ 13 ویں سے 18 ویں صدی تک فارسی زبان میں ہندستان میں ہزاروں کی تعداد میں تاریخی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں تقریباً ہر نوعیت اور ہر موضوع سے متعلق کتابیں تھیں۔ اس مستحکم پس منظر میں اردو زبان میں تاریخ نویسی کا آغاز ہوا۔

18 ویں صدی کے نصف آخر میں شمالی ہندستان کا بیشتر حصہ انگریزوں کے زیر تسلط آچکا تھا۔ یہ فطری بات تھی کہ نئے حکمراں طبقے میں اس نئے ملک کے ماضی اور اس کی تاریخ کو جاننے کی خواہش تھی۔ چنانچہ انگریز حکمرانوں اور افسروں نے فارسی کی تاریخی کتابوں کے ترجمے میں دلچسپی لی اور دو طرح کے تراجم سامنے آئے۔ اہم ماٰخذ کو مکمل طور پر اور نسبتاً کم اہم ماٰخذ کے اقتباسات کو انگریزی زبان میں منتقل کیا گیا۔ ان تراجم پر مبنی کئی کتابیں بھی انگریزی زبان میں لکھی گئیں اور اقتباسات پر مبنی ایک طویل سلسلہ Dowson اور Elliot نے شائع کیا۔ بدقسمتی سے یہ کوششیں تعصب اور بددیانتی سے متاثر رہیں۔ ان انگریز مورخوں کی بیّن کوشش یہ تھی کہ مسلم حکمرانوں کے عہد کو ظلم و زیادتی پر مبنی ثابت کرسکیں تاکہ اس کے برعکس وہ انگریزوں کی حکومت کو انصاف پسند اور رعایا پرور ظاہر کرسکیں۔

18 ویں صدی کے اواخر میں ہی اردو زبان بھی ترقی کی نئی منزلیں سر کر رہی تھی اور رفتہ رفتہ فارسی کی جگہ اردو کی مقبولیت محض عوامی زبان کے طور پر نہیں، بلکہ علمی و ادبی زبان کے طور پر بن رہی تھی، چنانچہ فارسی تصنیفات کے اردو ترجمے بھی شائع ہوئے۔ اس کی اہم مثالیں شمس سراج عفیف کی مشہور تصنیف ''تاریخ فیروز شاہی'' کا تلخیص شدہ اردو ترجمہ ہے' مترجم وارث علی ہیں جو شاہ جہاں آباد کے ساکن تھے۔ اس کتاب میں فیروز شاہ کے طویل عہد حکومت (1351 تا 1388) کے حالات و واقعات کا بیان ہے اور سلطان فیروز شاہ کے سلسلے میں اسے فارسی ماٰخذ میں سب سے معتبر کہا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ نہ صرف معلومات کے اعتبار سے، بلکہ زبان کی شگفتگی اور روانی کے اعتبار سے بھی لاثانی ہے۔ ان ہی حالات میں علم تاریخ کے متعلق مستند معلومات اردو کے ذریعے حاصل کرنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ چنانچہ یہ اعزاز اردو کو ہی

● مضمون نگار پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں سینئر پروفیسر اور خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے ڈائرکٹر ہیں۔

حاصل ہے کہ ہندستانی زبانوں میں تاریخ نویسی کی جدید روایات کا آغاز اردو سے ہی ہوا۔ یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ 1832 میں تمام انگریز افسران کا علم حاصل کرنا لازمی کر دیا گیا تھا۔

اردو زبان میں تاریخ نویسی کے ابتدائی مراکز میں فورٹ سینٹ جارج (مدراس) اور فورٹ ولیم کالج (کلکتہ) قابل ذکر ہیں۔ 19ویں صدی ربع ثانی میں دہلی کالج تاریخ نویسی کے ایک نئے مرکز کے طور پر ابھرا۔ یہاں تاریخ نویسی کی ایک دلچسپ اور قدرے جداگانہ مثال ملتی ہے جب انگریزی میں لکھی کتابوں کے اردو ترجمے مرتب ہوئے۔ لیکن اس سے الگ بھی اردو میں تاریخی کتابیں لکھنے کا عمل جاری تھا۔ اس دوسری روایت کی ایک ابتدائی مثال سید رستم علی بجنوری کی تصنیف 'قصہ و احوال روہیلہ' ہے جو 75-1774 میں John H. Ford نامی ایک انگریز افسر کی فرمائش پر لکھی گئی۔ کچھ مورخوں کے مطابق یہ اردو زبان میں تاریخ کی پہلی مستند کتاب تھی۔ اس میں مغلیہ سلطنت کے ادبار اور دربار اودھ کے زریں دور کے آغاز کے احوال ملتے ہیں۔ یہ original (خلقی) تصنیف ہے جس میں مصنف نے ذاتی معلومات کی بنا پر واقعات کو بیان کیا ہے۔

اس روایت کی مربوط و مبسوط شکل مولانا ذکاء اللہ دہلوی، شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی تصنیفات میں ملتی ہے۔ انھوں نے نوآبادیاتی روایت تاریخ نویسی (Colonial Historiography) کے بالمقابل فارسی کے مستند ماخذ کی بنیاد پر تاریخی حقائق کے آشکار کرنے اور انگریز مورخوں کے ذریعے مسخ شدہ حقائق کی درستگی کی قابل صد ستائش اور کامیاب کوشش کی۔ بہت حد تک اس روایت کو آج بھی دارالمصنفین (اعظم گڑھ) نے جاری رکھا ہے۔

18ویں صدی کے نصف آخر سے 20ویں صدی کے نصف اوّل تک اردو میں تاریخی کتابیں مستقل طور پر لکھی جاتی رہیں۔ ان کی مجموعی تعداد کا تعین تو ممکن نہیں کیوں کہ اب بھی بعض نسخے دریافت ہو رہے ہیں۔ لیکن ایک تخمینے کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں ہزاروں کتابیں شامل ہیں۔

اگر چند نمائندہ مثالوں کا جائزہ لیں تو پہلی مثال کا تعلق تاریخ عالم سے ہے اور اس کا ایک نادر نسخہ خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ اس کا عنوان ہے 'لب التواریخ'۔ یہ کتاب تین جلدوں میں ہے جن کی طباعت 30-1829 میں ہوئی۔ تینوں جلدیں تقریباً 1000 صفحوں پر محیط ہیں۔ یہ original تصنیف نہیں، بلکہ Alexander Tytler کی انگریزی تصنیف Elements of General History کا اردو ترجمہ ہے۔ مترجم Lewis de Costa ہے اور اس کے معاونوں میں حکیم عبدالماجد سرفہرست ہیں۔ De Costa کلکتہ میں مقیم عیسائی تھا جو فارسی اور اردو زبانوں میں اچھی دسترس رکھتا تھا اور اس کی یہ تصنیف اپنی نوعیت کی ایک منفرد مثال ہے۔ اس کتاب میں سیلاب نوح سے واقعات کا بیان شروع ہوتا ہے۔ قدیم مصر، فلسطین، یونان اور بازنطینی سلطنت کا ذکر پہلے حصے میں ملتا ہے، دوسرے میں عروج اسلام سے 17ویں صدی عیسوی کے واقعات درج ہیں اور تیسرے حصے میں 1825 تک والئی انگلستان جارج سوئم کے عہد حکومت اور ہندستان میں برطانوی فتوحات کا ذکر ہے۔ نیز شعرا اور ادبا، فلسفیوں اور فنکاروں کا بھی ذکر اس میں ملتا ہے۔

تاریخ ہندستان کی غالباً اولین مثال اسی عنوان کے تحت لکھی گئی کتاب ہے جس کے مصنف کا نام معلوم نہیں ہے۔ اس کا سال تصنیف 84-1781 ہے۔ اس میں امیر تیمور کے عہد حکومت سے واقعات کا بیان شروع ہوتا ہے اور جنگ میسور دوئم (81-1780) پر ختم ہوتا ہے۔ کتاب بنیادی طور پر سیاسی واقعات اور جنگوں کے تذکرے پر مبنی ہے۔ انداز بیانیہ ہے اور واقعات کو ایک تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے مگر واقعات کی تشریح یا ان کے محرکات و اثرات کی وضاحت کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

علاقائی تاریخوں میں کئی نام آتے ہیں لیکن سب سے اہم ''تاریخ بہار' ہے جس کے مصنف اردو کے مشہور شاعر شاد عظیم آبادی ہیں۔ کتاب دو حصوں میں ہے۔ پہلے حصے کا تعلق بہار کی تاریخ سے ہے اور دوسرے کا تعلق عظیم آباد کی سماجی اور ثقافتی زندگی سے۔ اس کتاب کی اشاعت 1924 میں ہوئی۔ کتاب کے پہلے حصے میں شاد نے زمانہ قدیم سے 19ویں صدی کے اواخر تک بہار کے تاریخی حالات کا عمومی جائزہ لیا ہے۔ ان کے ماخذ میں فارسی اور انگریزی کی مستند تاریخیں شامل ہیں۔ لیکن شاد نے یہاں محض خوشہ چینی کی ہے اور کوئی نئی یا بنیادی معلومات وہ فراہم نہیں کر سکے ہیں۔ کتاب کا دوسرا حصہ بہ عنوان ''نقش پائدار'' کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ اس میں شاد نے اپنے مشاہدات کی بنیاد پر ہم عصر شہر عظیم آباد کا ایک ثقافتی خاکہ مرتب کیا ہے جو معلومات افزا بھی ہے، دلچسپ بھی اور اہم بھی۔

چھٹی صدی ق م سے ماقبل آزادی (1943) تک بہار کی ایک مربوط و مبسوط تاریخ فصیح الدین بلخی نے بھی مرتب کی۔ اس کی اشاعت 1944 میں انجمن ترقی اردو کے ذریعے ہوئی۔ اشاعت نو خدا بخش لائبریری نے دو سال

قبل کرائی۔ اس کتاب میں مستند تاریخی مآخذ کا استعمال ہوا ہے اور مورخ نے ایک اعلامحققانہ معیار بنائے رکھا ہے۔

بہار سے متعلق مقامی تاریخوں کی بھی بہتیری مثالیں ہیں۔ 'ریاض ترہت'، 'گلزار ابرار'، 'تاریخ لحیہ' وغیرہ لیکن میں خصوصی ذکر کرنا چاہوں گا ابومحمد شیخ ابوالعلائی کی ''تاریخ سہسرام'' (1981) کا۔ دو جلدوں پر محیط یہ کتاب علاقائی تاریخ کی ایک اہم مثال ہے۔ مصنف نے بذات خود اس میں تین طرح کے واقعات کی شمولیت کا ذکر کیا ہے۔ اوّل تاریخی واقعات، دوم سنی سنائی باتیں اور سوم ذاتی استحقاق کے نتیجے میں حاصل شدہ معلومات۔ کتاب کا سب سے طویل حصہ شیر شاہ سوری اور اس کے اسلاف و اخلاف کی تاریخ بیان کرتا ہے اور اس حصّے کا مآخذ افغانوں کی مستند تاریخیں مثلاً "تاریخ داؤدی"، "تاریخ شیر شاہی" وغیرہ رہی ہیں۔ مصنف نے اس علاقے کے آثار قدیمہ، مدارس، مزارات، لوگوں کی رسم و رواج وغیرہ کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے سہسرام سب ڈویژن سے متعلق اہم اعداد و شمار یکجا کرلیے ہیں اور اس طرح یہ کتاب سہسرام سے متعلق ایک غیر سرکاری گزیٹیر کی شکل اختیار کرگئی ہے۔

اسی ضمن میں شاد کی تصنیف ''نقش پائدار'' اور اس سے زیادہ تفصیلی کتاب بدرالحسن کی ''یادگار روزگار'' کا ذکر مناسب ہوگا۔ یہ دونوں کتابیں عظیم آباد کی ثقافتی زندگی کا ایک تفصیلی خاکہ پیش کرتی ہیں۔ ''یادگار روزگار'' زیادہ مفصل ہے۔ یہ 6 جلدوں پر مشتمل ہے۔ ان میں 4 جلدیں اوائل 20ویں صدی کے شہر پٹنہ کے اہم وارڈوں پر منقسم ہیں۔ چوک، خواجہ کلاں، سیٹی کورٹ اور پیر بہور، بقیہ دو کی شکل ضمیموں کی ہے۔ خدابخش لائبریری نے ان کی اشاعت 1991 میں کرائی ہے۔ اشاعت اوّل کا سال 1931 ہے۔ دونوں کتابوں کے مجموعی متن پر اگر نظر ڈالیں تو ان میں اہم عمارات، مدارس، مزارات، درگاہیں، مسجدیں، امام باڑے، علما و شیوخ، شعرا اور ادبا، حکما و فضلا اور دیگر باکمال حضرات، انگریزی تہذیب اور طرز زندگی سے پیدا ہوئے مسائل اور اس سلسلے میں لوگوں کے ردعمل، مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی اور سماجی صورت حال کا ذکر ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ شہر عظیم آباد کا اس سے بہتر خاکہ کسی دوسری زبان کی کسی تصنیف میں نہیں ملے گا۔ میں نے ان مآخذ پر مبنی چند مضامین شائع کیے ہیں اور مجھے کہنے میں خوشی ہورہی ہے کہ اس کے نتیجے میں انگریزی زبان میں پٹنہ کی Urban History یا شہری تاریخ پر کچھ نئے کام ہوئے ہیں اور نئی راہیں کھلی ہیں۔ اسی طرز پر چند سال پہلے جناب بدرالدین احمد کی کتاب ''حقیقت بھی کہانی بھی'، بہار اردو اکادمی نے 1988 میں شائع کی تھی۔ گذشتہ سال ہی اس کی اشاعت ثانی اکادمی کے ذریعے ہوئی ہے۔

عام تاریخی تصانیف سے قدرے جداگانہ کچھ مثالوں کا بھی ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ آثار قدیمہ کے تذکروں میں سب سے پہلی اور سب سے مستند کتاب سرسید احمد خاں کی ''آثارالصنادید'' ہے جس کی اشاعت اول 1847 میں ہوئی۔ اس کتاب میں سرسید نے دلّی کی قدیم عمارتوں کی ایک مفصل رپورٹ پیش کی تھی۔ پہلی جلد 4 ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں دلّی کے اردگرد واقع عمارات کا ذکر ہے، دوسرے میں لال قلعہ اور اس کے احاطے میں واقع عمارات کا ذکر ہے، تیسرے میں شاہ جہاں آباد کے عمومی آثار کا ذکر ہے جب کہ چوتھے باب میں دلّی کی اہم شخصیتیں شامل فہرست ہیں۔ تمام عمارتوں کے کتبوں کے متن بھی محفوظ کیے گئے ہیں اور یہی اس کتاب کی انفرادی شان ہے۔ حال میں (1990) اس کی اشاعت نو زیر ادارت ڈاکٹر خلیق انجم ہوئی ہے۔ اگرچہ سرسید نے مستند مآخذ کا استعمال نہیں کیا ہے اور بعض عمارتوں کی شناخت میں انھوں نے غلطیاں بھی کی ہیں لیکن ایک explorer کی حیثیت سے انھوں نے جو کام کیا ہے وہ یقیناً بے نظیر ہے۔ اس کتاب کی افادیت کا تھامس اور ریورٹی نے بھی اعتراف کیا ہے۔ اس طرز پر فصیح الدین بلخی صاحب نے بھی اردو زبان میں پٹنہ کے مقابر و مساجد کے اہم کتبات کی فہرست مرتب کی ہے جو 1993 میں بعنوان ''پٹنہ کے کتبے'' خدابخش لائبریری سے شائع ہوئی۔

آخر میں مَیں یہ اعتراف کرنا چاہوں گا کہ میری پیش کردہ فہرست نہ تو مکمل ہے اور نہ ہی مفصل۔ میرا یہ مقصد بھی نہیں تھا۔ میرا مقصد صرف چند مثالوں کے ذریعے اس بات کی وضاحت کرنا تھا کہ اردو پہلی ہندستانی زبان ہے جس میں تاریخ نویسی کی جدید روایات پروان چڑھیں۔ یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اردو میں لکھی گئی تاریخ کی ان کتابوں میں کتنا تنوع تھا اور کتنی انفرادیت تھی۔ میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اردو زبان کا دامن انتہائی وسیع ہے اور اس میں ہر طرح کی تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے امکانات ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم انھیں پہچانیں اور مزید پروان چڑھائیں۔

(بشکریہ ''اردو نامہ''، پٹنہ، 27 جون 2004)

□□□

خالد سعید

ادبِ اطفال کی تدریس

ادب اطفال سے مراد وہ تحریریں ہیں جو درسی کتب کے لیے یا تدریس کی غرض سے لکھی گئی یا مرتب کی گئی ہیں۔ اس مضمون کی حد تک اطفال سے مراد چھ تا بارہ سال کے بچے ہیں۔ کیونکہ تدریس کے مقاصد بچوں کی عمر اور درجوں (classes) کی مناسبت سے بدلتے جاتے ہیں۔ مثلاً چھوٹی جماعتوں کی تدریس کے مقاصد بڑی جماعت کے تدریسی مقاصد سے یقیناً مختلف ہوں گے۔

اس طرح خود تدریس کی دو صورتیں ممکن ہیں: رسمی تدریس اور غیر رسمی تدریس۔ دونوں کے مابین جو فرق پایا جاتا ہے وہ ایک مثال سے ظاہر ہے۔ فرض کیجیے، ایک کہانی ہے، جو کسی درسی کتاب میں بھی شامل ہے اور اسی کو ہماری دادی لماں بھی سناتی ہیں — تو دادی لماں اسے بطور کہانی سنائیں گی اور استاد اسے بطور سبق پڑھے گا۔ ظاہر ہے، اس ایک متن کے دو مختلف وقوعوں میں بچوں کی شرکت و شمولیت بھی مختلف ہوگی اور نتائج بھی۔ ایک میں تدریس کا عنصر حاوی ہوگا تو دوسرے میں تفریح کا۔

اس کے علاوہ تدریس کا مقصد، ایک متعینہ مدت میں درج ذیل اغراض اور نشانوں تک رسائی حاصل کرنا ہوتا ہے۔

1- **لسانی اغراض:** حرف شناسی سے عبارت نویسی تک، یعنی حرف شناسی، لفظ شناسی، لفظ کی بناوٹ سے واقفیت، ذخیرۂ الفاظ کا فروغ، جملہ شناسی، انشا نگاری، عبارت نویسی وغیرہ۔

2- **فنی اغراض:** چار بنیادی مہارتوں کا فروغ اور ان مہارتوں کی مختلف نوعیتوں پر قدرت حاصل کرنا، (مثلاً تکلم کی مہارت میں، رسمی گفتگو، غیر رسمی گفتگو، احترام آمیز گفتگو، بے تکلف گفتگو، صحیح انداز سے گفتگو، کسی واقعے کو بیان کرنے کی صلاحیت، قصہ گوئی، تقریر، مباحثے اور مکالمے وغیرہ پر قدرت)

- متن فہمی، شعر فہمی، نظم و نثر کی پہچان، نظم و نثر کے مختلف اسالیب سے لطف اندوزی۔

3- **انسانی و سماجی مقاصد:** انسانی رشتوں کی پہچان اور ان کا احترام، سماجی ذمے داریوں کا احساس، ماحولیات کی قدر، خیر و شر کی تمیز، خیر کی قدروں کی ترویج (مثلاً حق پرستی، دیانت داری، وفاداری، فرض شناسی، احسان مندی، ہمدردی، ایثار و قربانی، شجاعت، بھائی چارہ اور عصری آگہی وغیرہ۔)

4- **شخصی مقاصد:** ذہنی شخصیت کی نشو و نما، قوتِ ادراک کا فروغ و استحکام، تخیل کی پرورش، یادداشت کو مضبوط کرنا، قوت فیصلہ، قوتِ تمیز اور قوتِ مدرکہ کا فروغ و استحکام۔

(مندرجۂ بالا مقاصد محولہ بالا عمر کے بچوں کے لیے نئی تعلیمی پالیسی کے تحت حکومت کرناٹک کے سررشتۂ تعلیم کی فہرست کے مطابق ہیں)

رسمی تدریس میں ان سارے نشانوں تک ایک متعینہ مدت میں بڑی حد تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ محض اس وجہ سے ممکن ہے کہ یہ تدریس نظم وضبط اور ہنرمندی کے ساتھ انجام دی جاتی ہے۔ لیکن دقت اس وقت پیش آتی ہے، جب ان ضابطوں کی پابندی کی کوشش میں رفتہ رفتہ تدریسی سرگرمیاں استاد کی ذات کے اطراف گھومنے لگتی ہیں اور استاد خود کو تدریس و تعلیم کا مرکز و محور جاننے لگتا ہے۔ نتیجے میں تدریس محض ضابطوں کی تکمیل تک محدود ہو جاتی ہے۔ یعنی استاد کہانی کو بطور سبق پڑھاتا ہے۔ سبق کی مشقیں حل کراتا ہے۔ کاپیاں جانچتا ہے۔ میقاتی جانچ کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ سب ٹھیک ٹھاک چلتا ہے۔ لیکن پھر بھی تدریس کے مقاصد پورے طور پر مکمل نہیں ہو پاتے ہیں۔ تدریس کے عمل سے بے ساختگی اور بے تکلفی کے جوہر اٹھتے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے، جب کہانی سے دادی اماں کا سا انداز اٹھ جائے اور تدریس کی سرگرمیاں استاد کی ذات تک محدود ہو جائیں، تو اس نوعیت کی تعلیم و تدریس میں بچوں کی دلچسپی کیوں کر باقی رہ سکتی ہے۔ لہٰذا تعلیم و تعلم میں بچوں کی شرکت و شمولیت کم سے کم تر ہوتی جاتی ہے اور تدریس ایک بے جان، بے رس اور ایک میکانیکی عمل بن کر رہ جاتی ہے۔ اس نوعیت کی تدریس نصاب کی تکمیل کا ذریعہ تو ٹھہرتی ہے، طلبہ کی شخصیت کی تعمیر کا نہیں۔

یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہیے کہ دادی لماں جب کہانی سناتی ہیں، تو وہ اس وقوع میں مرکزی حیثیت کی حامل ہونے کے باوجود کچھ اس قدر بچوں کا پاس و لحاظ رکھتی ہیں کہ کہانی سنانے کے دوران ان کی حرکتیں، لہجہ اور ان کا اندازِ گفتگو اطراف بیٹھے ہوئے بچوں سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ عرض کرنا یہی ہے کہ جماعت میں استاد کہانی کو سبق کے طور پر نہ پڑھے۔

فرض کیجیے، اقبال کی نظم 'ہمدردی'، شاملِ نصاب ہے۔ اس کی تدریس یوں بھی ہو سکتی ہے کہ جماعت میں ایک لڑکا بلبل بن جائے اور ایک جگنو، اور

دونوں اپنے ساتھیوں کے آگے نظم اسٹیج کریں۔ مصرعوں کو مکالموں کی صورت ادا کرنے میں اگر بچوں کو دقت ہوتی ہو تو پھر استاد خود جگنو اور بلبل دونوں کا رول اسٹیج کرے۔ مصرعوں کو مکالموں کی طرح پورے جذباتی اتار چڑھاؤ کے ساتھ ادا کرے۔۔۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ لہجے کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے بچوں کو مصرعوں کی صحیح قرأت کا اندازہ ہوگا۔ اور اس کھیل کی وجہ سے تدریس میں تفریح کا مزہ آئے گا اور بچوں کی شمولیت واقعتاً بڑھے گی۔ تعلیم و تعلم بچوں پر گراں نہیں گزرے گا۔

یہی نہیں، تدریس کو یکسانیت سے نجات دلانے اور ایک میکانیکی عمل بننے سے بچانے کے لیے، مونو ایکٹنگ، ممکری، مائم، باڈی لینگویج، ٹیبلو، ڈرامے، تمثیلیں، گروہی کھیل، لسانی کھیل، خود کلامی، مکالمے، مباحثے وغیرہ جیسی دلچسپ اور تفریحی سرگرمیاں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ استاد کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ نظم و نثر کے مختلف اسالیب کی صحیح قرأت کا شعور رکھتا ہو۔ کیوں کہ توضیحی نثر کی قرأت کا ڈھنگ بیانیہ نثر کی قرأت سے مختلف ہوگا۔ ڈرامے کی قرأت کا انداز علمی مضمون کی قرأت سے مختلف ہوگا۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ متن فہمی کا آدھا مرحلہ مناسب اور صحیح قرأت سے ہی حل ہو جاتا ہے۔

عمل تدریس کا دوسرا شعبہ جانچ کا (Evaluation & Tests) ہوتا ہے تو اس شعبے میں بھی اس طرح کی سرگرمیاں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ یعنی راست سوال کرنے کے بجائے سرگرمیوں پر مبنی سوالات پوچھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً کسی شعر کا مطلب لکھنے کے لیے کہنے کی بجائے ہم خود بورڈ پر شعر کا مطلب لکھ دیں اور مطلب سے متعلقہ شعر نظم سے ڈھونڈ نکالنے یا نشان زد کرنے کے لیے کہیں۔ اس تجویزی طریقۂ سوال (Suggestive Question Method) سے اول تو ایک فائدہ یہ ہوگا کہ شعر کا مطلب کس طرح لکھا جاتا ہے، بچوں کو معلوم ہو جائے گا۔ دوم یہ کہ حل کی تلاش میں بچے کو متن دوبارہ پڑھنا پڑے گا۔ پھر متعلقہ متن کی شناخت کے لیے بچے کو اپنی قوتِ تمیز اور قوتِ مدرکہ کو استعمال میں لانا ہوگا اور جب وہ مطلب سے متعلقہ شعر کی نشاندہی کردے گا تو مطلب یہ ہوگا کہ اس میں شعر فہمی کی صلاحیت جاگ چکی ہے۔ گویا یہ سرگرمی روایتی سوالیہ انداز کے مقابلے میں دلچسپ ہوگی اور معنی خیز بھی۔

اسی طرح متنی یا لسانی مشقوں کے معاملے میں Analogies پر مبنی سرگرمیاں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً کسی متن پر مبنی ایسی دو دو جوڑیاں بنائیں جن میں معنوی، متنی یا لسانی مناسبتیں پائی جائیں اور پہلی جوڑی کی معنوی مناسبت کی رعایت سے دوسری جوڑی کو مکمل کرنے کو کہا جاسکتا ہے۔ مثال کے لیے ایک بار پھر اقبال کی نظم ہمدردی ہی کو لیں۔ اس نظم کے متن پر مبنی مختلف مناسبتوں کی حامل درج ذیل جوڑیاں بنا کے پوچھی جاسکتی ہیں:

1- رات: اندھیرا:: دن: ....
2- آہ وزاری: رونا پیٹنا:: آشیاں:.......
3- بلبل: ہر چیز پہ چھا گیا اندھیرا:: جگنو:..........
4- بلبل: مصیبت کا مارا:: جگنو:.......

غرض یہ اور اس طرح کی دیگر سرگرمیوں پر مبنی سوالات پوچھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً معمّے، پہیلیاں، چیستاں، لسانی کھیل، ادھوری عبارتیں، بے ترتیب عبارتیں، تصحیح طلب عبارت، تحریریں، اجتماعی قصہ طرازی، بیت بازی، اجتماعی نظم خوانی، نظم کی تکمیل، عبارت آرائی، نعرہ نویسی، اشتہار سازی، تجویز عنوان، تقاریر، فی البدیہہ تقاریر، مباحثے، اخبار خوانی، واقعات طرازی وغیرہ جیسی دلچسپ سرگرمیوں اور ذہنی مشغلوں کے سبب جانچ جیسا خشک شعبہ بھی دلچسپ دکشش انگیز بن جائے گا۔ ان سے ایک تو تدریس کے لسانی، متنی، تفہیمی اور شخصی مقاصد کی تکمیل ہوگی اور تعلیم و تعلم بھی ایک دلچسپ مشغلہ بن جائے گا۔

ممکن ہے کوئی کہے کہ اس طرح سے تو نصاب کی تکمیل ہو چکی۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ بچوں میں تعلیم اور تعلم کے تئیں تجسس پیدا ہوگا۔ وہ اپنے طور پر پڑھنے اور سمجھنے کے لیے مائل ہوں گے اور پھر یہ ضروری بھی نہیں کہ استاد ہر سبق یا ہر نظم کو اسٹیج کر کے ہی دکھائے۔ اس طرح کی بس دو ایک سرگرمیوں کے سبب سے بھی اگر بچوں میں پڑھنے پڑھانے کے عمل سے ایک بار رغبت پیدا ہو جائے۔۔۔ تو پھر تدریس کے آگے کے مرحلے استاد کے لیے خود بہ خود آسان ہوتے جاتے ہیں اور تدریس ایک میکانیکی عمل سے بننے سے بچ جاتی ہے۔

Deptt. of Urdu, Karnatak College, Bedar, Karnatak

□□□

جوابات کوئز

1- ب 2- ج 3- الف 4- د 5- الف 6- ج
7- الف 8- ب 9- د 10- الف 11- ج 12- د
13- د 14- ج 15- ب 16- ج 17- د 18- ج
19- ب 20- الف 21- ج 22- ب 23- الف 24- ب
25- ج 26- ب 27- د 28- ج 29- ب 30- ج
31- د 32- ب 33- الف 34- الف 35- ب 36- ج
37- ب 38- الف 39- ب 40- الف 41- ب 42- ج
43- ج 44- ب 45- الف 46- ج 47- د 48- الف
49- ج 50- الف 51- ب 52- ب 53- الف 54- د

تحریر: چھما شرما
ترجمہ: جاوید اقبال

وہ ہمیں سکھا سکتے ہیں

ان دنوں بچے بگڑ گئے ہیں۔ وہ کسی کی نہیں سنتے۔ انھیں صرف کھانے، پینے اور موج اڑانے میں دلچسپی ہے۔ وہ اپنی ہر بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ چٹو ہیں، ان کا وزن بڑھ رہا ہے اور طرح طرح کی بیماریاں انھیں اپنی گرفت میں لے رہی ہیں۔

بچوں کے بارے میں یہ رائے ہماری دادی، نانی کی نہیں (جن سے ہمیں ہمیشہ شکایت تھی اور اکثر ان کی بات ہم نے نہیں مانی) خود ہماری ہے۔ ہماری نسل کے لوگ جو زرعی معاشرے سے باہر نکل آئے تھے، انھوں نے اپنے اعتبار سے دائروں اور بندشوں کو توڑا تھا۔ آج بچوں کے بگڑ جانے، ان کے خودغرض اور مطلب پرست ہو جانے پر رو رہے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اپنے وقت میں تعمیل حکم کا سب سے اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ اپنے وقت میں ہماری نسل جن بندشوں کو توڑنے میں خوشی محسوس کرتی تھی، آج وہی نسل بندشوں میں جکڑے بچوں کو دیکھنے کے لیے بے قرار ہوئی جا رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ جن بندشوں کو ہم نے کبھی نہیں مانا وہ ہمیں بہت اچھے لگنے لگے ہیں اور انھیں ہم بچوں کی پشت پر لاد دینا چاہتے ہیں؟

کولڈ ڈرنک، پزا (Pizza)، برگر (Burger)، نانی، کیک اگر آج کے بچوں کو پسند ہیں اور وہ لڈو نہیں کھانا چاہتے تو اس میں کیا برائی ہے؟ ہر نسل اپنے حساب سے کھاتا، پیتا ملے کرتی ہے اور وہی کھاتی ہے جو رواج میں ہوتا ہے۔ دراصل ہم وہی کھاتے ہیں جس کی پیداوار ہمارے آس پاس ہوتی ہے۔ کھانے پینے کا سیدھا تعلق اس خاص مقام پر پیدا ہونے والی فصلوں سے بھی ہے، یہ ہم سب جانتے ہیں۔ پھر شہروں کے بچے اگر جنک فوڈ (Junk Food) کو اپنی پہلی پسند سمجھتے ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر ان چیزوں کے اشتہاروں پر نظر ڈالیں تو ہم پائیں گے کہ جن بچوں کی تصاویر اشتہار میں دکھائی جاتی ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ ایسے بچے اسمارٹ ہوتے ہیں، وہ سبھی مشکلوں کو عبور کر سکتے ہیں، وہ آگے ہی آگے بڑھتے ہیں۔ انھیں کبھی مشکلوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اگر کچھ چیزیں کھانے ہی سے اتنا بس کچھ ہو جائے تو کیا برا ہے۔ محنت کرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں، ایک Pizza کھاؤ اور آسمان پر چڑھ جاؤ۔ اگر بچے حقائق سے دور نکل گئے تو ہمیں یہ ضرور جاننا چاہیے کہ آخر ایسا کیوں ہوا ہے؟ ہمارے رونے یا ناک بھوں سکوڑنے سے بچے نہیں بدلنے والے۔ ان کی سوچ سمجھ، کھانا پینا ہماری ناراضگی کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ہمارے غلام نہیں ہیں۔ جو نمونے لگاتار ان کے سامنے پیش کیے جا رہے ہیں اگر وہ ویسے ہی ہوئے جا رہے ہیں تو شکایت کیوں؟ ویسے بھی بچوں کی فطری نشوونما اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب انھیں آزادی ملے۔ ہاں اس آزادی میں ان کا دماغی اور جذباتی نقصان پوشیدہ نہ ہو۔ لیکن نہیں، جس تعمیل حکم سے ہم نے ہمیشہ بچنے کی کوشش کی اسے ہم اپنے بچوں کی پشت پر لادنے کو ہر وقت تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ متوسط طبقے کے ہر انسان کی یہ مصیبت ہے کہ وہ اپنے بچوں سے وہ کرانا چاہتا ہے جو اس نے خود کبھی نہیں کیا۔ ورنہ بچوں کے بگڑ جانے کی شکایت ہی کیوں ہو؟

اگر غور سے دیکھا جائے تو اس نسل کے بچے بے حد ہوشیار ہیں۔ انھیں سکھانے والے، اچھی باتیں بتانے والے صرف والدین یا کنبے کے لوگ ہی نہیں ہیں، ٹیلی ویژن بھی ان کا بہت بڑا استاد ہے۔ وہ بھی انھیں بہت کچھ سکھا رہا ہے۔ ہمارے ایک دوست کا تین سال سے بھی کم عمر کا بچہ اس بات کی بہت اچھی مثال ہے کہ اسکرین پر نظر آتے ہی وہ پہچان لیتا ہے کہ یہ لالو پرساد یادو ہیں، یہ مایاوتی یا یہ وزیر اعظم من موہن سنگھ۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ کس چینل پر کیا آتا ہے؟ نیوز ریڈر کا نام کیا ہے؟ کیا ہماری نسل کے کسی بچے کے بارے میں ایسا سوچا جا سکتا ہے۔ ایسے میں بڑے بچوں سے یہ امید کرنا کہ وہ فرماں برداری کی زندہ مثال پیش کریں گے اور اس دور کے شرون کمار کہلائیں گے، غلط ہے۔ پھر یہ بھی صحیح نہیں کہ اس دور کے بچوں کو صرف اپنا خیال ہے، ان کو کوئی معاشرتی لگاؤ ہی نہیں رہا۔

کچھ سال پہلے ایک پوش علاقے میں رہنے والے بچوں نے اپنے پڑوس میں گھریلو نوکرانی کا کام کرنے والی ایک بچی کو آزاد کرایا تھا۔ کچھ دنوں پہلے ممبئی میں ہوا حادثہ آپ سب نے پڑھا ہوگا۔ ممبئی میں ''گیٹ وے آف انڈیا'' کے پاس ہوئے بم دھماکے میں پانچ غریب بچوں کے ماں باپ مارے گئے تھے۔ ان میں سب سے بڑی بچی کی عمر تیرہ سال تھی۔ ان سبھی بچوں کو ایک مشہور پبلک اسکول کے بچوں نے گود لے لیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ چاہتے

ہیں کہ یہ بچے بھی انھی کی طرح پڑھیں، لکھیں، آگے بڑھیں۔ ان یتیم بچوں کی نہ صرف پڑھائی، لکھائی بلکہ کھانے، پینے اور رہنے کی ذمے داری بھی ان بچوں نے لے لی۔ اندور کی بچی پلک، جو گاتی ہے اور اپنی ساری آمدنی دل کے مرض میں مبتلا بچوں کو دے دیتی ہے، اس کا نام تو گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج ہو چکا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا یہ سبھی مثالیں یہ بتاتی ہیں کہ ہمارے بچے بہت زیادہ خود غرض ہو گئے ہیں، یا ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بچوں میں احساسِ ذمے داری بڑھی ہے اور کسی ضرورت مند کے لیے کچھ کرنے کی خواہش میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

بزرگ اکثر بچوں کی دنیا پر حق جمانے کو تیار بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک بار نہرو جی ''یومِ اطفال'' کے موقع پر ایک پروگرام میں گئے۔ وہاں وہ اس امید سے گئے تھے کہ انھیں بچوں کے کچھ مزے دار پروگرام دیکھنے کو ملیں گے لیکن ہوا اس کا اُلٹا۔ صرف نہرو جی کی موجودگی نے بڑوں کو اتنا فعال کر دیا کہ وہ اسٹیج چھوڑنے کو تیار ہی نہ تھے۔ کچھ دیر تک تو نہرو جی دیکھتے رہے پھر انھیں اتنا غصہ آیا کہ وہ اپنا مسند اٹھا کر پروگرام پیش کرنے والوں کی طرف دوڑ پڑے۔ نہرو جی کی یہ تصویر بہت مشہور بھی ہوئی۔ کہیں ہماری حالت بھی یہی تو نہیں کہ ہم اپنے بچوں کو کوئی جگہ نہیں دینا چاہتے۔ ہم صرف اس نسل کے بچوں کی نکتہ چینی کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ نکتہ چیں بننا، دوسروں کی برائی دیکھنا اور بچوں کو شرمندہ کرنا سب سے آسان کام ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم اس نسل کے بچوں سے ان باتوں کی امید لگائے بیٹھے ہیں جو ہم نے اپنی خودمختاری کی حفاظت کے نام پر کبھی نہیں کیا اور اس بات کا احساسِ جرم ہمیں کھائے جا رہا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ جو لکیریں ہم نے کھینچ دیں، ہمارے بچے اس پر سرپٹ دوڑ پڑیں۔ لیکن بچپن کو اگر لکیروں کی زنجیروں میں جکڑیں گے تو وہ بچپن کہاں رہے گا؟ اور ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے بچے بے وقت ہی بوڑھے ہو جائیں۔ وہ نئی نسل کے بچے ہیں، وہ تیز رو تبدیلی کی آندھی میں پل بڑھ رہے ہیں، اگر وہ اتنا تیز دوڑنا چاہتے ہیں جس کا تصور بھی ہمیں نہ ہو تو اس میں برا کیا ہے؟ ہر وقت ان کی برائی ڈھونڈنے کی جگہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم ان سے سبق لیں۔ ان کی خوبیوں پر توجہ دیں اور ہم دیکھیں گے کہ اس نسل کے بچے ہمیں بہت کچھ سکھا سکتے ہیں جو ہم اپنے والدین سے نہیں سیکھ پائے۔

(بشکریہ ''ہندستان'' نئی دہلی، 14/نومبر 2003)

425, Mansarowar Hostel,
Delhi University, Delhi-7

□□□

گاندھی کی کہانی

مصنف: راجکماری شنکر/مترجم: نامی انصاری

اس کتاب میں بابائے قوم کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ
ہندستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ بھی عام فہم زبان میں درج کی گئی ہے۔
گاندھی جی اور ان سے متعلق دیگر افراد کی تصویریں بھی کتاب میں موجود ہیں۔

صفحات: 120، قیمت -/35 روپے

بچوں کے نہرو

ایم. چالاپاتھی راؤ/مترجم: نامی انصاری

پنڈت جواہر لال نہرو بچوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور اس لیے بچے انھیں
چاچا نہرو کہتے تھے۔ اس کتاب میں جدید ہندستان کے اس معمار کی حیات
اور شخصیت کے تمام گوشوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 112، قیمت: -/32 روپے

اندرا پریہ درشنی

مصنف: اکا شنکر/مترجم: بشیق مظفر پوری

اس کتاب میں تقریباً تین دہائیوں تک ہندستانی سیاست پر
چھائی رہنے والی اندرا گاندھی کی شخصیت اور زندگی
کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 142، قیمت: 45 روپے

شنکر

مصنف: اکا شنکر/مترجم: انیس اعظمی

ملک کے مایۂ ناز کارٹونسٹ کیشو شنکر پلئی
کی سوانح، جو دلچسپ بھی ہے اور
حوصلہ بخشنے والی بھی۔

صفحات: 128، قیمت: -/35 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے %40 کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

شمس الرحمٰن فاروقی

اکبر الٰہ آبادی: نئی تہذیبی ریاست اور بدلتے ہوئے اقدار

(2)

اکبر کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ سیاسی فاتحوں کے طور طریقوں میں سیاسی مفتوحوں کے لیے کس قدر کشش اور جاذبیت ہوتی ہے۔ مفتوح خود کو فاتح کے رنگ میں رنگ لینا چاہتا ہے تاکہ تفاوت مابین کم ہو۔ اور اکبر کے زمانے کی ہندستانی زندگی اور ادب میں بے شمار مثالیں اس بات کی موجود تھیں کہ مفتوح قوم کو غیر شعوری طور پر اس بات کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے کہ وہ فاتح قوم کے اندر حاکم طبقے کے ساتھ اتحاد ذہنی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ مفتوح قوم کی روزمرہ تہذیب میں فاتح تہذیب کے طاقتور اور مقبول علائم اور نشانات داخل کردیے جائیں۔ مفتوح کو فاتح کی طرف مائل کرنے کے لیے تہذیبی حربے اگر سیاسی حربوں سے زیادہ موثر نہیں تو ان کے برابر اثر انگیز یقیناً ہیں۔

اکبر کی اہم ترین بصیرت یہ تھی کہ انھوں نے نو آبادیات کار قوم کی تہذیب اور اس کی سیاست، اس کے نظم حکومت، اور اس کے ضوابط کو متحد قرار دیا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انگریز کو جواب دیا تو شاعری کے ذریعے، کہ ہند+مسلم سماج میں شاعری سے زیادہ موثر اور قوت مند کوئی دوسرا تہذیبی حربہ نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ''گاندھی نامہ'' کو شاہنامۂ فردوسی کے متقابل رکھتے ہیں، حالانکہ ''گاندھی نامہ'' کئی مختصر اور سیاسی طور پر واضح منظومات کا مجموعہ ہے، اور شاہنامۂ فردوسی میں زمین پر قبضہ جمانے اور غیر اقوام کو بزور شمشیر محکوم بنانے کی طویل داستانیں ہیں۔ اس کے برخلاف ''گاندھی نامہ'' میں غیر قوم کو اپنے ملک سے بے دخل کرنے کی باتیں ہیں۔

یہ باتیں آج کل فیشن کے طور پر مقبول ہیں کہ آج کے مابعد نوآبادیاتی دور میں مغرب کی سامراجی، سرمایہ پرست تہذیب محیط الارضی (global) اقدار و تصورات کے نام پر ہماری تیسری دنیا کی تہذیب کو اپنا محکوم بنانے کے درپے ہے۔ فیشن کے طور پر کہی جانے کے باوجود یہ بات ہندستان جیسے ملکوں کے لیے اپنے اندر صداقت کا بڑا عنصر رکھتی ہے کہ مغرب کی تمنا ہے کہ تیسری دنیا کے لوگ اس کے تہذیبی! اقدار و اطوار کو تا حد امکان قبول کرلیں۔ تہذیبی علائم کی سیاسی معنویت کو سمجھنے والوں میں اکبر ہمارے یہاں سب سے پہلے تھے:

یورپ میں گو ہے جنگ کی قوت بڑھی ہوئی
لیکن فزوں ہے اس سے تجارت بڑھی ہوئی

ممکن نہیں لگا سکیں وہ توپ ہر جگہ
دیکھو مگر پیئرس کا ہے سوپ ہر جگہ[20]

آلات رسل و رسائل میں ترقی اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ تجارت اور زندگی اور عشق کرنے کے بھی طریقوں میں ''ترقی'' اور تبدیلی آتی ہے:

اب کہاں دستِ جنوں تار گریباں اب کہاں
پانیر اور دستِ مجنوں اور خبر ہے تار کی
لے لیا شیریں نے کمسریٹ میں ٹھیکہ دودھ کا
ریل بنوانے لگے فرہاد اب کہسار کی[21]

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا
جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں[22]
میں ہوا ان سے رخصت اے اکبر
وصل کے بعد تھینک یو کہہ کر[23]

ہندستان میں انگریزوں کے طرز حکومت کو خود انگریز حکام نے اکثر ''جابرانہ، لیکن مہربان، اور قانون کا پابند'' (benevolent despotism, and the rule of law) کہا ہے۔ جابریت چاہے جتنی بھی مہربان کیوں نہ ہو، اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ قواعد و ضوابط بکثرت نافذ کرتی ہے۔ اکبر کی نگاہ میں برطانوی قواعد و ضوابط کا وفور ایک طرح کا تہذیبی حملہ تھا کیوں کہ اس کے باعث ہندستانیوں کو اپنا طرز حیات بدلنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ اکبر نے اکثر اس قواعدی وفور کے لیے ''لیسنس'' کا استعارہ برتا ہے۔

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں، ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا[24]

راہ میں لیسنس ہی کافی ہے عزت کے لیے
بس یہی لے لیجیے تلوار رہنے دیجیے[25]
پوچھتے کیا ہو کہ تو ہیرو ہے یا ہرجس ہے
بندہ جو کچھ ہو بہر حالت بلا لیسنس ہے[26]

اکبر الٰہ آبادی کی بدلتی ہوئی دنیا میں صرف ان چیزوں کے زیاں کا درد نہیں جو کھو گئیں۔ انگریزوں کا مفتوح اور زیر نگیں ہندستانی جب ان کے

نوآبادیاتی نظام کا حصہ بنا تو اس نے جوش وفاداری میں انگریز کے بھی کان کاٹ لیے اور '' جابر لیکن مہربان'' دیسی افسر بدیسی سے بڑھ کر استبداد پسند نکلا:

تہمد میں بٹن جب لگنے لگے جب دھوتی سے پتلون اگا
ہر پیڑ پہ اک پہرہ بیٹھا ہر کھیت میں اک قانون اگا[27]

اکبر کے کلام کا وہ حصہ جدید نقادوں کے لیے سب سے زیادہ برہمی کا باعث بنا ہے جہاں وہ پائپ کے پانی اور چھاپہ خانہ اور اخبار اور ریل گاڑی جیسی کھلی ہوئی منفعت بخش اشیا و ایجادات کو بھی بظاہر مسترد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سرسری نظر سے پڑھیے تو واقعی تعجب، بلکہ افسوس بھی ہوتا ہے کہ اکبر نے جدید اور روشن خیال زندگی کی ایسی کارآمد اور ضروری اشیا خیر مقدم کرنا تو کجا، انھیں اپنے یہاں بار دینے سے بھی انکار کیا۔ لیکن اصل معاملہ کچھ اور رہے۔ اکبر کا احتجاج ترقی کے ان نئے وسائل کے خلاف نہ تھا۔ ان کا احتجاج یہ تھا کہ ان کی نظر میں یہ نئی چیزیں غلامی کی علائم تھیں، اور یہ کہ نام نہاد ترقی اور بہتری کے پردے میں یہ تبدیلیاں ہندستانی طرز معاشرت اور تہذیب کو تباہ کرنے کا کام کر رہی تھیں۔ ان تبدیلیوں (مثلاً پانی کے نل کے ذریعے گھر بیٹھے پانی کی سہولت) کا فائدہ تو چند ہی لوگ اٹھا سکتے تھے، لیکن اکبر کی نگاہ پانی کے پائپ کے ساتھ واٹر ٹیکس، سڑکوں پر کیچڑ اور آب استادہ کی فراوانی اور اس کی پیدا کردہ ماحولیاتی آلودگی پر بھی تھی۔ شہروں میں واٹر ورکس کے قیام کا ایک ناپسندیدہ نتیجہ ان کی نظر میں یہ بھی تھا کہ زندگی سے کنویں غائب ہونے لگے، اور روزانہ استعمال کے پانی کے سرچشمے کے طور پر ندیوں کا استعمال ختم ہونے لگا۔ علاوہ ازیں، انھیں یہ بھی احساس تھا کہ یہ نئے طریقے شہروں کی اقتصادی زندگی اور قدرتی ماحول پر برا اثر ڈال رہے ہیں:

طاعون و تپ و کھٹمل مچھر سب کچھ ہے یہ پیدا کیچڑ سے
پیسے کی روانی ایک طرف اور ساری صفائی ایک طرف[28]

کشتِ دل کو نفع پہنچے اشک ایسی چیز ہے
دیدۂ گریاں پہ واٹر ٹیکس کی تجویز ہے[29]

یہ موج فیض ہے تہذیب کی یا اس کا طوفاں ہے
کنواں موجود ہے گھر میں تو پھر پانی کا نل کیسا[30]

اس بات کی وضاحت چنداں ضروری نہیں کہ گھر کے کنویں کو پانی کا ایسا سرچشمہ قرار دینا جو گھریلو، خالص اور استعمال کنندہ کے پورے قابو میں ہے، کنویں کو پوری ہندستانی تہذیب کی علامت بنا کر پیش کرنا ہے اور میرے خیال میں اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس تبدیلی کا مطلب اکبر کی نظر میں کیا تھا؟ ہم میں سے جو لوگ کرشن لیلا، اور ندی کنارے یا پنگھٹ پر گوپیوں اور پانی بھرنے والیوں کے ہجوم وغیرہ باتوں کی تہذیبی اہمیت سے واقف ہیں وہ اس نکتے کو زیادہ بہتر طور پر محسوس کر سکتے ہیں کہ حساس دل والوں کے لیے ایسے پانی کا تصور کس قدر ناپسندیدہ ہوگا جو تجارتی مال کی طرح کسی کمپنی یا ادارے کے قبضے میں ہو اور لوگ اس بات پر مجبور ہوں کہ پانی جیسی چیز بھی کسی کمپنی یا ادارے سے قیمتاً حاصل کریں۔ پانی کی رسد اور تقسیم کے نئے طریقوں کے باعث ان تہذیبی اقدار و روایات اور اس ادبی اور انسانوی سرمائے کے محو ہو جانے کا امکان تھا جن کا تعلق کنویں، پنگھٹ، ندی کے گھاٹ اور باہر سے یا کچھ فاصلے سے پانی لانے اور لے جانے سے تھا۔

وہ ذہن جو ہندستانی روایت کی گود میں پلا بڑھا تھا، اس کے لیے کنواں محض کنواں اور دریا محض دریا نہ تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ندی اور کنویں کے پانی کی کوئی قیمت نہ تھی اور اس کی تجارت نہ ہوتی تھی۔ دیہات میں بھی، جہاں ذات پات کی تفریق یا دوسری وجوہ کی بنا پر کنویں بنے ہوئے تھے، کسی کنویں سے پانی کا استحقاق رکھنے والے بے قیمت پانی لیتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے کنویں یا ندی کے پانی پر پانی نکالنے والے کا اختیار تھا، یعنی وہ جانتا تھا کہ یہ پانی کیسا ہے اور کتنا ہے۔ پائپ کے پانی میں یہ بات نہ تھی، کہ یہاں تو صارف کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہ تھا۔ واٹر ورکس والے جب چاہتے اور جتنا چاہتے، اور جس رفتار سے چاہتے، پانی مہیا کرتے تھے اور پھر شاید سب سے اہم بات یہ تھی کہ کنواں یا دریا کے گھاٹ جذباتی اور روحانی لین دین کی جگہ تھے اور سماجی، تہذیبی اور مذہبی زندگی میں ان کی اہمیت تھی۔

دلی جیسے بڑے شہروں میں بھی کنوؤں کی کتنی اہمیت تھی اس کا کچھ اندازہ غالب کے خطوط سے ہو سکتا ہے۔ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے جو آفت 1857 اور 1858 میں دہلی والوں اور دہلی کی عمارتوں پر توڑی، اس پر بس نہ کر کے آئندہ کے تین چار برس میں ترقی اور پھر ریل کی سہولت کے نام پر انگریزوں نے دہلی میں مزید توڑ پھوڑ کی۔ مجروح کے نام ایک خط مورخہ 1860 یا 1861 میں غالب لکھتے ہیں:

قاری کا کنواں بند ہو گیا۔ لال ڈگی کے کنویں ایک دم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا...... قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا، تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔''(31)

پائپ کا پانی تمام کنوؤں کی جگہ تو نہ لے سکتا تھا، اور کنویں کے پانی کی طرح بے قیمت بھی نہ تھا۔ لیکن بات صرف زحمت اور قیمت کی نہ تھی۔ بات دراصل ایک نئی طرح کی پابندی کی تھی، کہ اب پانی آپ کی مرضی کا تابع نہ تھا، آپ پانی والے کی مرضی کے تابع تھے۔ اگر پائپ نہ چلے تو پانی نہ ملے۔ پانی اب ایک قدرتی وسیلہ نہ تھا بلکہ انسانی مصنوعات کے زمرے میں آ گیا تھا۔

اکبر نے ایک بار قمر الدین احمد کو اپنا شعر سنایا

پائپ کوئی کھلا نہیں گھر میں لگی ہے آگ
اب بھاگنا ضرور ہوا غور کیا کریں

قمرالدین احمد لکھتے ہیں کہ اکبر نے اس شعر کی توجیہ حسب ذیل بیان کی:

"[اکبر نے] فرمایا کہ تھوڑا عرصہ ہوا چوک کی دوکانوں میں آگ لگی۔ اس وقت پائپ بند ہونے سے رعایا کا سخت نقصان ہوا۔ میں نے مذکورہ شعر اس خیال سے متاثر ہوکر لکھا تھا۔ کیا کہا جائے۔ صاحب کی، آب و دانہ پہ حکمرانی ہے اگر اس وقت زمانہ سابق کی طرح کنویں ہوتے تو آگ بر وقت قابو میں لائی جاسکتی تھی۔ شہروں میں ترمیم دیکھو کہ حکمراں طبقہ اور امرا سول لائن میں ہیں، غربا کے لیے زیست کے دن گزارنے کے واسطے شہر کے گندے گوشے علاحدہ ہیں۔ مراد اس سے یہی ہے کہ امیر و غریب یکجا نہ ہوں گے، نہ ایک دوسرے کے دکھ درد سے ہمدردی ہوگی۔" (32)

یہاں یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ اکبر نے رعایا کی تفریق اور تقسیم کی بات کی ہے اور نئی طبقاتی حد بندیوں کے وجود میں آنے کی طرف جو اشارہ کیا ہے وہ اپنے وقت سے بہت آگے کی بات ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں کہیں جاکر شہری منصوبہ بندی کے ماہروں اور ماہرین اقتصادیات نے شہروں میں اس تفریق کی برائیاں محسوس کیں جو نئے نظام کے تحت انگریزوں نے یہاں رائج کی تھیں۔

ثقافتی قوت اور سماجی زندگی میں تسلسل کی علامت کے طور پر ہمارے یہاں دریاؤں کی اہمیت کنوؤں سے بھی زیادہ تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ مختلف دریاؤں کا پانی الگ الگ خواص رکھتا ہے۔ بعض دریاؤں کا تقدس اس پر مستزاد تھا۔ یہ بات کچھ غیر معمولی نہ تھی کہ مسافر اپنے ساتھ گنگا، یا کسی اور پسندیدہ ندی کا پانی ساتھ لے کر چلتے تھے۔ محمد تغلق (زمانہ حکومت 1325 تا 1351) جیسا عقلیت کوش سلطان بھی اپنا مرغوب گنگا جل ایک ہزار میل دور دکن دیس میں ہر روز منگاتا تھا۔(33)

اکبر اعظم کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ گنگا کا ہی پانی پیتا تھا۔ لیکن پانی کے بارے میں اس کے یہاں اور تکلفات بھی تھے۔ ابوالفضل نے ان دریاؤں کا ذکر کیا ہے جہاں کا پانی اکبر کے باورچی خانے میں استعمال ہوتا تھا(34)۔ حقیقت یہ ہے کہ مغل بادشاہوں کو ماحول کی آلودگی، پانی کی صفائی اور اس طرح کی "جدید" چیزوں سے بہت شغف تھا اور ظاہر ہے کہ اس شغف نے ایک طرف ہندستانی تہذیب پر اثر ڈالا ہوگا تو دوسری طرف اس شغف کے پیدا ہونے میں خود ہندستانی تہذیب اور رسوم کا بھی دخل رہا ہوگا۔ جہانگیر نے گجرات کے حالات میں لکھا ہے کہ یہاں کے لوگ پانی کو ٹھیک سے جمع نہیں کرتے ہیں۔ گجرات میں طریقہ تھا کہ صاحب ثروت لوگ اپنے تہ خانوں میں بڑے بڑے حوض بنا کر (جہانگیر نے لفظ "برکہ" لکھا ہے) ان میں پانی بھر کر بند کر دیا کرتے تھے۔ جہانگیر نے لکھا ہے کہ بھلا ایسا پانی کیوں کر نہ معتر ہوگا جسے مہینوں تک ہوا نہ لگے اور جس کے بخارات کو اٹھنے اور زائل ہونے کا موقع نہ ہو(35)۔

آج کے وقت اور مقام کے قریب تر آیئے تو غالب کے خطوط ہیں جن میں دریاؤں کے پانی کا بطور خاص ذکر ہے۔ رام پور کی کوسی ندی کی ثنا میں غالب لکھتے ہیں:

"پانی کا شکر کس منھ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، ہاضم، سریع النفوذ۔"

پانی سبحان اللہ۔ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔(36)

اس طرح کے طور طریقوں، رسوم و رواج، اور ندی یا دریا کے پانی کی اس مرکزیت کے نقصان نے اکبر سے حسب ذیل طرح کے شعر کہلائے۔ ہم انھیں محض قدامت پرستی کا اظہار سمجھیں تو یہ اکبر کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا
حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے
شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے 37

شاہ ایڈورڈ کی دہائی میں طنز کی معراج ہے، اس کی وضاحت شاید ضروری نہ ہو۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ ٹائپ کے حرف کے خلاف احتجاج صرف اس بنا پر نہ تھا کہ ٹائپ کے حرف چھوٹے ہوتے تھے۔ یہ معاملہ طریق پیداوار اور بلندی معیار پر مصنف کے قابو کا بھی تھا۔ طباعت کے زمانے کے پہلے کتابیں اکثر کسی خطاط سے نقل کرائی جاتی تھیں اور خطاط سے کام لینے والا شخص، جو اکثر مصنف ہی ہوتا تھا، اکثر اس کے کام پر ذاتی نگاہ رکھتا تھا اور چونکہ ہر کتاب گویا اپنی جگہ پر بے نظیر تھی اور خطاط اسلوب تحریر، روشنائی، سجاوٹ، حجم اور تقطیع، ہر چیز میں صاحب معاملہ کی مرضی کا پابند تھا، لہٰذا اس طرح جو کتاب تیار ہوتی تھی، اصولاً وہ اغلاط سے آزاد اور مطلوبہ معیار کی ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ چھاپے خانے سے نکلنے والی کتاب پر مصنف کا کچھ واقعی قابو نہ تھا۔ لیکن اغلاط کے لیے بسا اوقات مصنف ہی کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا تھا۔

غالب کی مثال سامنے کی ہے۔ وہ اپنی کتابوں پر مطبع کا نہیں، بلکہ اپنا قابو چاہتے تھے تاکہ معیار سے تجاوز نہ ہو۔ ان کے خطوط میں جابجا کاتب یا

پریس یا پروف پڑھنے والے کے بارے میں شکایت ملتی ہے۔ ''دستنبو'' کی طباعت کے نگراں مرزا تفتہ تھے، انھیں نہایت اصرار سے غالب لکھتے ہیں: ''کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور رخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔''(38)

اب دیوان اردو کے بارے میں سنیے:

''ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا، متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا، وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔''[39]

جنون بریلوی کو غالب نے لکھا کہ کاتب کی غلطی بے وجہ مصنف کے سر مڑھ دی جاتی ہے۔ لوگ نسخۂ مطبوعہ میں غلطی کا احتمال جائز نہیں رکھتے۔ کاپی نویس کے جرم میں مصنف بے چارہ ماخوذ ہوتا ہے۔''(40)

اس طرح دیکھیے تو ٹائپ کے حرف کے خلاف خفیف مزاحیہ سے احتجاج کے پردے میں اکبر دراصل اس کثیر پیداواری تہذیب کی شکایت کر رہے ہیں جس میں کثرت اور عجلت کی خاطر معیاروں کو پست کر دیا جاتا ہے۔ جو چیز کہ پہلے فن پارے کا درجہ رکھتی تھی اب سرد اور بے جان طریقوں سے بنتی ہے اور اس میں اغلاط بے شمار ہوتے ہیں۔ انھی وجوہ سے اکبر کو فوٹوگرافی بھی پسند نہ تھی اور گراموفون بھی، کہ دونوں ہی میں شخص اور اس کے صفات الگ ہوجاتے ہیں اور چھپی ہوئی تصویر تو اور بھی ناپسندیدہ تھی کہ وہ نقل کی نقل ہے۔

ہم کو اپنے البم پر ناز کا ہے کیا محل
بے حد ارزاں ہوگیا ہے اب تو فوٹو آپ کا
آپ کے درشن مصور کے بھی حصے میں نہیں
بس لیا جاتا ہے فوٹو ہی سے فوٹو آپ کا[41]
کیا عجب ہوگئے مجھ سے مرے دمساز جدا
دور فونو میں گلے سے ہوئی آواز جدا[42]

کچھ ایسا ہی تناؤ، بلکہ شاید اس سے بدتر، ٹیلیفون کے ساتھ تھا، کہ ٹیلیفون نہ صرف لاشخصی ہے، بلکہ چونکہ اس پر بات کرتے وقت مخاطب سامنے ہوتا ہی نہیں، لہٰذا فون پر انکار آسان ہوتا ہے۔

امید چشم مروت کہاں رہی باقی
ذریعہ باتوں کا جب صرف ٹیلیفون ہوا[43]

اکبر کی نگاہ میں اخبار بھی ایک طرح کا تہذیبی حملہ تھا۔ برطانوی تجارت اور برطانوی اطلاعات میں وہ کوئی فرق نہ دیکھتے تھے۔ (یہ فرق ہمیں اب نظر آرہا ہے جب اس کو قائم ہوئے ایک صدی گزر چکی)۔ دوسری بات یہ تھی کہ جارحانہ انداز فروشندگی کے باعث اخبار نہ صرف تجارت کا آلۂ کار تھا، بلکہ غلط اطلاعات کا بھی قاصد تھا۔ اشتہار کی دنیا میں ہر چیز اپنی جگہ پر بہترین تھی اور ہر چیز کسی اور ضرورت کو راہ دیتی تھی۔ پھر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اخباروں کا دبدبہ بہت تھا، لہٰذا بھولے بھالے ہی نہیں پڑھے لکھے ہندستانی لوگ بھی اس بات کے مشتاق رہتے تھے کہ اخبار میں ان کا نام آجائے اور اگر کوئی تحریر چھپ جائے تو کہنا ہی کیا ہے۔ اخبار کو اس قدر باعزت بنا دینا اکبر کی نگاہ میں قومی وقار کے منافی تھا:

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے[44]
اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجیے
اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجیے
دیکھوں جسے وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا
بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجیے
چشم جہاں سے حالت اصلی چھپی نہیں
اخبار میں جو چاہیے وہ چھاپ دیجیے[45]
گھر کے خط میں ہے کہ کل ہوگیا جہلم اس کا
پانیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے[46]
ہوائے طوبیٰ ہے اب نہ سر میں نہ موج کوثر ہے اب نظر میں
ہوس اگر ہے تو بس یہی ہے کہ ہم بھی چھپ جائیں پانیر میں[47]
مجھے بھی دیجیے اخبار کا ورق کوئی
مگر وہ جس میں دواؤں کا اشتہار نہ ہو[48]

آخری شعر خاص طور پر دلچسپ ہے۔ اپنی معمولہ ذکاوت اور دوراکی کے باعث اکبر یہ بات جان گئے تھے کہ اشتہار چھاپنا اخباروں کا اصل کام نہیں۔ انگلستان میں جب اخبار چھپنا شروع ہوئے تو ان میں پارلیمنٹ کی بحثوں کی روداد کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ یہ تو انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب اور اس کی پیدا کردہ خواندہ مل مزدوروں کی فوج کثیر کے باعث تھا کہ اخباروں میں جرائم، فوجداری مقدمات، اغوا وغیرہ ''سنسنی خیز'' خبریں بھی شائع ہونے لگیں۔ اشتہار تو اور بھی دیر میں آئے، یعنی اس زمانے میں، جب اسمبلی لائن کا طریقۂ پیداوار وصنعت رائج ہوا اور ہر چیز بہت وافر تعداد میں بننے اور بنائی جانے لگی۔ اس طرح اخبار، جو اصلاً سیاسی تعلیم کا وسیلہ تھا، بڑے بزنس اور جارحانہ فروشندگی کے میدان کا اہم کھلاڑی بن گیا۔

اخبار کو اشتہار کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے، ایسا لگتا ہے کہ انیسویں صدی کے ہندستان میں بھی کئی لوگ اس خیال کے حامل تھے۔ اخبار کا انگریزی روپ جس میں وہ ہر فن مولاقسم کا رہنما تھا، ہندستانی تہذیب کے ساتھ کچھ زیادہ ہم آہنگ نہ تھا۔ سرشار کا ''فسانۂ آزاد'' ایسا متن نہیں ہے جس میں

ہندستانی تہذیب، خاص کر ہندو+مسلم مخلوط تہذیب کی ثنا خوانی ہو۔ سرشار کی نظر میں کوئی بات اسی وقت سچی ثابت ہوتی ہے جب انگریز اس کی تصدیق کرے۔ کتاب کے بالکل شروع میں میاں آزاد اور ایک حسین بازاری کی حسب ذیل گفتگو ملاحظہ ہو:

''آزاد: آج پروفیسر لاک صاحب زبان پاک سنسکرت کی اشرفیت پر لکچر دینے والے ہیں۔ یہ بزرگوار بڑے مقدس اور عالم یگانہ، یکتائے زمانہ، مشہور دیار و امصار ہیں۔ چھمی جان: لاحول ولا قوۃ، بھئی خدا کی قسم کتنے بھونڈے ہو، کتنا خراب مذاق ہے۔ پروفیسر صاحب کے مشہور ہونے کی ایک ہی کہی۔ ہم اتنے بڑے ہوئے آج تک نام بھی سنا ہو تو قسم لیجیے۔ کیا دنی خاں سے زیادہ مشہور ہیں؟'' (49)

ہندستانی عورت کی دنیا کتنی تنگ اور اس کا دماغ کس قدر چھوٹا اور خرافات سے بھرا ہوا ہے، اس کو چھوڑیے، اس بات کو دیکھیے کہ سنسکرت [یعنی ہندستانی تہذیب] کی خوبی بس اتنی، اسی حد تک اور اسی وقت ہے جب کوئی مغربی [یعنی انگریز] عالم اس کی تصدیق کرے۔ میاں آزاد نمائندہ ہیں نئے انسان کے جس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور چھمی جان [یہاں وہ محض طوائف نہیں بلکہ پوری ہندستانی تہذیب کی نمائندہ ہے] اس قدر الٹی عقل کی ہے کہ جب کوئی مغربی [انگریز] عالم اس کی خوبیاں بیان بھی کرنا چاہتا ہے تو وہ سنتی نہیں، اپنی ہی گاتی رہتی ہے۔ یہ تہذیب بے عقل بھی ہے اور زوال آمادہ بھی۔ اسے یقین نہیں کہ کوئی یورپی عالم اس کے طبلیے کے برابر شہرت یافتہ ہو سکتا ہے۔

خیر، تو اب اسی ''فسانۂ آزاد'' میں اخبار کا حال پڑھیں، پھر اکبر کے نقطۂ نظر کی بنیاد واضح ہو جائے گی۔ میاں آزاد کے ایک دوست بہار کو یہ بات کچھ پسند نہیں آئی ہے کہ اخبار میں کسی خالی اسامی کے بارے میں اشتہار چھپا ہے کہ لوگ اس کے لیے درخواست دیں:

''بہار۔ خدا کامیاب کرے۔ لیکن سنیے تو سہی، یہ تو اخبار ہے۔ اس میں خلوئے عہدہ اور تنخواہ، اور درخواست کا کیسا جھگڑا؟ اس میں محاربہ کا حال، یا جنگ و جدال، علمی اور پولیٹیکل قیل و قال چاہیے یا یہ جنجال؟ آزاد۔ تو قبلہ آپ نے اخبار پڑھا ہی نہیں۔ پیرومرشد، اخبار تو عطر مجموعہ ہے۔ لڑکوں کا اتالیق، جوانوں کا ناصح شفیق، بڈھوں کے تجربے کی کسوٹی، رکن رکین سلطنت، تجار کا دوست، صناعوں کا یار غار، رعایا کا وکیل، جمہور انام کا سفیر، مدبروں کا مشیر۔ کسی کالم میں ملکی چھیڑ چھاڑ، کہیں سوشل امور میں تکرار۔ کہیں اشعار آبدار، کہیں نوٹس اور اشتہار۔ انگریزی اخباروں میں طرح طرح کی باتیں درج ہوتی ہیں، اور دیسی اخبار بھی ان کا تتبع کرتے ہیں۔'' (50)

ظاہر ہے کہ یہاں بھی میاں آزاد نئے انسان کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ ان کے لیے اخبار صرف اطلاعاتی کاغذ نہیں، تعلیم کا بدل اور ذہنوں پر قبضہ قائم کرنے کا طاقتور وسیلہ ہے۔ میاں آزاد کو اخبار کی ہر فن مولائی، طریقۂ فروشندگی، ذاتی معاملات کو برسر عام زیر بحث لانے کی ادا، یہ سب باتیں بھلی لگتی ہیں اور اکبر کو انھی کی بنا پر اخبار سے شکایت ہے۔ اخبار ایک مادہ پرستانہ اور دنیا دارانہ شے ہے۔ اکبر کی نظر میں اس کا اولین مقصد علم یا اطلاع کا فروغ نہیں، تجارت اور انگریزی حکومت کے انتظامی اور سیاسی مفادات و مقاصد کا فروغ ہے۔ پدم سنگھ شرما کے نام ایک خط میں اکبر نے اخبار کو ان اشیا کی ضمن میں رکھا تھا جو ان کے خیال میں تفریق اور چشمک کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتی ہیں:

''ایک ایک بادۂ خود پرستی میں محو و سرشار ہے۔ کونسل اور کمیٹی اور اخبار موجود ہے۔ پھر آپس میں محبت بڑھانے، بھائی چارہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔'' (51)

(3)

برطانوی حکومت کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی مقاصد کو اخبار سے بھی زیادہ بہتر طور پر کوئی پورا کرتا تھا تو وہ ریل گاڑی تھی۔ اکبر نے مال گاڑی، ریل اور انجن کا تذکرہ بار بار کیا ہے

مال گاڑی پہ بھروسا ہے جنھیں اے اکبر
ان کو کیا غم ہے گناہوں کی گراں باری کا[52]

تنہائی و طاعت کا یہ دور ہے اب دشمن
پیڑوں پہ نہ وہ طائر صحرا پہ نہ وہ جوبن
جنگل کے جو تھے سائیں وہ ریل کے ہیں پائیں
املی کی جگہ سگنل قمری کی جگہ انجن[53]

اکبر کے ماحولیاتی سروکار اور ترددات اپنے زمانے سے آگے تو ہیں ہی، اپنی شدت میں وہ ان کے سماجی اور سیاسی ترددات سے کم نہیں۔ مومن کے شاگرد میر حسین تسکین دہلوی کا یہ شعر سب کا سنا ہوا ہوگا

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی[54]

اکبر کی پیروڈی انتہائی پر لطف لیکن اندر ہی اندر تلخی سے بھری ہوئی بھی ہے۔

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے
کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی[55]

ریلوے انجن نے جدید انسان کو رعونت اور غیر ضروری خود اعتمادی سے بھر دیا ہے:

سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات
انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجیے[56]
آگے انجن کے دین ہے کیا چیز
بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز[57]

اکبر نے ریلوے انجن کا ذکر بڑی تلخی اور طنز اور کثرت سے کیا ہے۔ ریل کے فوائد سے تو سبھی آگاہ تھے، لیکن ریل کے سماجی اور تہذیبی نقصانات پر اکبر کی نظر جس طرح پڑی ہے اس کی مثال مل نہیں سکتی۔ انھیں پورا احساس تھا کہ نو آبادیوں کے اقتصادی استحصال کے آلے، اور نظام حکومت میں ایک طاقتور سیاسی بیان کے طور پر ریل گاڑی ایک نہایت موثر ایجاد ہے۔

اس کا پیسجنا ہے اور اس کے ہیں بھپارے
یورپ نے ایشیا کو انجن پہ رکھ لیا ہے[58]

میں نے اس مضمون میں اکبر کی زبان اور ان کے اسلوب کے حسن پر اظہار خیال کرنے سے گریز کیا ہے۔ لیکن یہاں میں ''انجن پہ رکھ لیا ہے'' کے زور اور بلاغت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ (59) تلوار پر رکھ لینا، تلوار کی باڑھ پر رکھ لینا، گولیوں کی باڑھ پر رکھ لینا، وغیرہ محاورے تو ہیں ہی، انگریزی کا محاورہ To put to the sword بھی ذہن میں آتا ہے۔ پھر ''پہ رکھ لیا ہے'' میں شکار مار کر گھوڑے کی پشت یا زمین پر رکھ لینے کا پیکر صاف نظر آتا ہے۔ ''پہ رکھ لیا ہے'' میں ملازم رکھنے''، یا ''ڈیوٹی پر لگانے'' کا مفہوم بھی ہے، اور بھی نکات ہیں، لیکن بات یہاں ختم کرتا ہوں کہ اکبر نے صرف ہندستان اور برطانیہ کا ذکر نہیں کیا ہے، ایشیا اور یورپ کی بات کی ہے۔ مزید کچھ شعر دیکھیے

مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت
کبوتر اڑ گئے انجن کی پیں سے[60]
کہتے ہیں راہ ترقی میں ہمارے نو جواں
خضر کی حاجت نہیں ہم کو جہاں تک ریل ہے[61]

اکبر الہ آبادی اور اقبال ہمارے اولین اور سب سے بڑے پس نو آبادیاتی ادیب ہیں۔ دونوں کو برطانوی طرز فکر و حیات کی اچھی واقفیت تھی اور دونوں ہی کو مغرب کچھ مرعوب نہ کر سکا۔ اس بات کو مدنظر رکھیں کہ بیسویں صدی کے اوائل اور انیسویں کے اواخر میں ہمارے دانشور سب کے سب مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا تھے، تو یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ (62) مغرب کے بارے میں اقبال کی معلومات براہ راست تھیں اور مغرب سے ان کے اختلاف کی بنیادیں فلسفیانہ اور دانشورانہ تھیں۔ عبدالماجد دریا بادی کے نام اکبر کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اکبر بھی مغربی افکار سے بیگانہ نہیں تھے۔ (63) لیکن ان کے سروکار اور ترددات زیادہ تر عملی دنیا کے معاملات سے تعلق رکھتے تھے۔ اکبر کو جدید ہندستان کے سماجی، سیاسی اور مذہبی مسائل سے دلچسپی تھی۔ اقبال کا خیال تھا کہ انھوں نے ہندستان، اور خاص کر ہندستانی مسلمان کے مسائل کے ایسے حل ڈھونڈ لیے ہیں جو عملی بھی ہیں اور فلسفیانہ بھی۔ لیکن اکبر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کچھ زیادہ اصلاح حال ممکن نہیں۔ انھوں نے 2/نومبر 1912 کے مکتوب میں پدم سنگھ شرما کو لکھا:

زمانے کا رنگ آپ دیکھ رہے ہیں۔ جھوٹی عزت اور نقصان رساں لذتوں کا شوق طبیعتوں پر غالب ہے۔ نام ہے ملکی ترقی کا لیکن کوشش ان باتوں کی ہو رہی ہے جن سے سوسائٹی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے(64)

اسی طرح، اپنی شاعری کے بارے میں 1917 کے ایک خط میں اکبر نے سید سلیمان ندوی کو لکھا:

یہ نظمیں انقلاب روکنے کے لیے نہیں ہیں، یادگار انقلاب ہیں۔
حصۂ دوم میں یہ شعر پایئے گا
نظم اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب
یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی[65]

خیال رہے کہ ''آئی'' کے معنی ''موت'' بھی ہیں۔ اس لفظ کا استعمال اشارہ کرتا ہے کہ اکبر کو خوب معلوم تھا کہ نیا سماج اور نیا نظام تو بہرحال آکر رہے گا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ پرانی تہذیبی اقدار کہاں تک ضائع ہونے سے محفوظ رکھی جا سکتی ہیں۔ وہ خود کو ایسی فوج کے پچھلے دستے کا سپاہی سمجھتے تھے جس کے پاؤں تو اکھڑ ہی چکے تھے اور وہ بس موخرہ صفوں میں کھڑے نبرد آزمائی کر رہے تھے۔ اسی باعث ان کی آواز میں تلخی کے ساتھ ساتھ گہرا درد بھی ہے۔ مغربی اقدار، مغربی طرز حکومت، اور پرانے اقدار کو ترک کر کے نئے کو اپنانے پر جو اصرار ان کے زمانے میں ہو رہا تھا، اکبر نے بے سوچے سمجھے اور محض قدامت پرستانہ ضد کی بنا پر ان کی مخالفت نہ کی تھی۔ بے شک ان کی تمنا تھی کہ ملک آگے بڑھے، جدید بنے، لیکن انھیں اس کی قیمت کے طور پر ہندو مسلم نفاق، اردو ہندی جھگڑا، عزت نفس کا زیاں، اقدار کو کہنہ قرار دیا جانا، مذہب اور تاریخ کا مسخ کیا جانا، جیسی باتیں منظور نہ تھیں۔

ممکن ہے کہ آج ہم میں سے کچھ لوگ خیال کریں کہ اکبر نے ضرورت سے زیادہ شدید ردعمل ظاہر کیا، یا پھر وہ معاملے کو کچھ سادہ اور سہل بنا کر پیش کر رہے تھے۔ لیکن اکبر کے خلوص اور ان کے موقف کی بنیادی درستی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اخبار، یا ریل گاڑی، کے خلاف نہ تھے، نہ وہ ان چیزوں کے خلاف تھے جنھیں انگریزی حکومت ''عوامی بہبود'' کے کام کہتی تھی۔ انگریزی عہد میں محکمۂ تعلیم کو Public Instruction کا محکمہ کہتے تھے۔ عمارتوں کی تعمیر کے محکمے کو اب بھی Public Works کا محکمہ کہا جاتا ہے۔ ''پبلک'' کے

نام پر یہ حملے ہمارے تہذیبی ورثے کا استحصال کر رہے تھے اور انگریزوں کی سیاسی اور اقتصادی برتری کو قائم کرنے، مستحکم کرنے اور پھیلانے میں معاون تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعد کی تاریخ نے اکبر کو بڑی حد تک صحیح ثابت کیا ہے۔

صدیق الرحمٰن قدوائی معدودے چند اردو نقادوں میں ہیں جنھوں نے اکبر کی ظرافت کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکبر خود پر ہنستے ہیں اور اس ہنسی کی تہ میں احساس شکست بھی ہے، لیکن اس کی تہ میں کہیں یہ علم بھی پنہاں ہے کہ دشمن، جو بظاہر کامیاب ہے، بالآخر اس کو ہم سے بھی بدتر شکست نصیب ہوگی۔(66) میرا خیال ہے یہ ذرا زیادتی کی بات ہے کہ اکبر کو بڑا شاعر ثابت کرنے کے لیے ہم انھیں مستقبل بینی کی بھی صفت سے متصف دیکھیں جو درحقیقت ان میں تھی نہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اکبر خاصے مضبوط دل دماغ کے شخص تھے، وہ کوئی چھوٹی موٹی قسم کی چیز نہ تھے۔ شکست خوردگی ان کے کلام میں ہو یا نہ ہو، لیکن تھڑ دلاپن اور گھبراہٹ کہیں نہ تھی۔

رالف رسل کا بھی خیال ہے کہ اکبر کی شاعری اور شخصیت میں کچھ اسی قسم کی عقلیت پسندی اور سرد ہوشمندی تھی جیسی وسط بیسویں صدی کے بعض مفکروں میں نظر آتی ہے اور جو خود شاید رسل صاحب کی فطرت کا خاصہ ہے۔ شاید اسی لیے رسل نے لکھا ہے کہ ''اکبر ان شعرا میں ہیں جو نئی اور پرانی روشنی کی آویزش کو دیکھتے ہیں لیکن وہ کسی ایک کی مکمل اور بے روک ٹوک حمایت نہیں کرتے۔'' (67) اس کے برخلاف، رسل اور خورشید الاسلام کی اس بات میں زیادہ وزن ہے کہ ''اکبر ہرگز کاٹھ کی طرح کٹر اور تخیل سے عاری اور ضدی قدامت پرست نہیں ہیں جیسا کہ بعض نے انھیں بیان کیا ہے...... اصلاً اور بنیادی طور پر وہ ایک ایسے شخص ہیں جسے تبدیلی کا احساس شدت سے ہے اور جو تبدیلی کے نامقاومت پذیر ہونے کا بھی احساس رکھتا ہے۔''(68)

جو تصور اکبر کی شاعری آخرکار ہم پر چھوڑ جاتی ہے وہ ایسے شخص اور شاعر کا ہے جسے معاملات کی سیاسی تہوں اور معنویتوں کا گہرا اور فوری احساس تھا۔ ایسا شاعر جس نے غضب کی حس مزاح اور طباعی قدرت سے پائی تھی اور جس نے اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی مسائل پر ناقابل یقین حد تک لسانی حسن اور نت نئے مضامین کی زرخیزی کے ساتھ لکھا۔ اگر کسی کو اکبر کے پیغام سے محبت نہ ہو (اور آج ایسے بہت سے ہیں) تو بھی وہ اکبر کی شدید حب الوطنی، اور انگریزوں کے خلاف ان کے دل میں اتنی ہی شدید نفرت کا احساس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہندستانیوں سے جب انگریزوں نے سماجی سطح پر میل جول شروع کیا تو انھوں نے ہندستانیوں کو مغرور، نازک مزاج اور نفاست پر خاص زور دینے والا، بلکہ انگریزوں کو بہ نگاہ تحقیر دیکھنے والا قرار دیا۔ انیسویں صدی کی آخری تہائی تک یہ سب بدل جاتا ہے۔ اب زیادہ تر ہندستانی، علی الخصوص، دانشور ہندستانی، اس رائے کے ہو جاتے ہیں کہ ہندستانی کے مقابلے میں یورپین، خاص کر انگریز، کی اخلاقی اور فنی برتری پر جو بھی کہا جائے کم ہوگا۔ اکبر اور اقبال یہاں ممتاز نظر آتے ہیں، اور انگریز کو اکبر جتنا ناپسند کرتے تھے اس حد تک شاید اقبال بھی انھیں ناپسند نہ کرتے ہوں گے۔

اکبر نے ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر کئی دلچسپ طنزیہ شعر لکھے ہیں۔ سب سے مشہور ترین حسب ذیل دو شعر کی نظم ہے جس میں حافظ کا ایک مصرع بڑی خوبی سے چسپاں کیا گیا ہے

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولے بوزنا ہوں میں
ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست[69]

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ اکبر نے ایک عشقیہ شعر کی پیروڈی کر کے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ یہاں وہ حافظ کے مشہور تر عشقیہ شعر کی دنیا سے جدید سائنسی فکر پر اظہار خیال کا نکتہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ حافظ کا شعر ہے

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست[70]

خیر، پیروڈی اور دوسروں کے مقولوں کو اپنے مطلب کا بنا کر برتنا تو اکبر کے خاص فنوں میں سے ایک فن تھا اور جگہ انھوں نے طنز کی وہ چھریاں چلائی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ قمر الدین احمد بدایونی لکھتے ہیں کہ 28 رجنوری، 1921 کو ایک گفتگو میں اکبر نے کہا:

اگر ڈارون کی یہ تھیوری درست ہے کہ انسان بندر سے پیدا ہوا ہے تو اس منزل تمدن پر اہل یورپ کو انسانیت کے بہت سے اعلیٰ محاسن کا حامل ہونا چاہیے تھا۔ مگر ایسا نہیں۔ اس پر افسوس کرتا ہوں

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں
ارتقا پر بھی آدمی نہ ہوئے[71]

اس طرح اکبر کی شاعری میں تہذیبی تاریخ کا چرخ پورا ہوتا ہے: بجائے اس کے کہ انگریز لوگ ہمیں حقارت سے دیکھیں، ہم انھیں حقارت اور مایوسی سے دیکھتے ہیں۔ اکبر کو اپنے شاعرانہ مرتبے کا پورا احساس تھا۔ بھلے ہی آج کے لوگ انھیں جوکر، یا قدامت پرست بھانڈ قسم کی چیز سمجھنے لگے ہوں، لیکن خود اکبر اس بات پر پوری طرح آگاہ تھے کہ ان کے مقاصد جلیل و سنجیدہ تھے اور وہ الفاظ کے بہت بڑے پارکھ اور بہت بڑے فن کار تھے۔

بہت سے اردو کے نقاد مصر ہیں کہ اکبر الٰہ آبادی ترقی اور روشن فکری

کے اندھے مخالف تھے۔ امید ہے کہ موجودہ تحریر نے اس رائے کے جھوٹ کو ثابت کرنے میں کچھ خدمت انجام دی ہوگی۔ لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ اکبر میں عزِ نفس کا پاس اور قومی افتخار کا احساس ان کے نکتہ چینوں سے زیادہ تھا اور شاعر کی حیثیت سے انھیں جزئیات بیں آنکھ اور انتہائی تیز کاٹ رکھنے والی طباعی ودیعت ہوئی تھیں۔ پھر انھیں اردو شاعری کے آہنگوں کا غیر معمولی احساس تھا، اور ان کی تکنیکی مہارت ایسی تھی کہ اقبال کے سوا اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ معاصر دنیا پر رائے زنی کرنے والے کی حیثیت سے ان کے کلام میں وہ دانش درانہ توانائی، وہ برفیلا جذبۂ تحقیر، اور وہ بھڑکتا ہوا غصہ ہے جو اٹھارھویں صدی کے بعد ہمارے یہاں ناپید تھا۔

لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی اکبر کا دل درد سے بھرا ہوا تھا۔ اپنی تاریخ اور تہذیب کا ضیاع و زیاں ان پر بہت شاق تھا، شاید خاص کر اس وجہ سے، کہ وہ جانتے تھے کہ میں خود بھی کسی نہ کسی طرح سے ان طاقتوں کا حصہ ہوں جو میرے ورثے کو لیے جا رہی ہیں۔ شاید ان کا یہ شعر ان کے لوحِ مزار کے لیے مناسب ہوتا

جو گزرو گے ادھر سے میرا اجڑا گاؤں دیکھو گے
شکستہ ایک مسجد ہے بغل میں گورا بارک ہے[72]

حواشی:

(1) ملاحظہ ہو "رقعاتِ اکبر"، مرتبہ ساحل احمد، اردو رائٹرز گلڈ، الٰہ آباد، 1997، ص-18، اکبر کے خطوں کا یہ مجموعہ پہلی بار لاہور سے محمد نصیر ہمایوں نے شیخ عبدالقادر کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ ساحل احمد نے اب اسے مفصل حواشی اور کچھ اضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔

(2) مکتوب علامہ اقبال مورخہ 17 دسمبر، 1914، بنام اکبر الٰہ آبادی، مشمولہ "کلیات مکاتیب اقبال" جلد اول، مرتبہ سید مظفر حسین برنی، دہلی اردو اکیڈمی، 1991، ص-320

(3) "کلیاتِ اکبر" جلد سوم، اسرار کریمی پریس، الٰہ آباد، 1940، ص-154۔

(4) "آبِ حیات" از محمد حسین آزاد، کلکتہ، 1967، ص-187۔

(5) آل احمد سرور، "تنقیدی اشارے"، نذیر احمد اینڈ سنز، علی گڑھ، 1942، ص-87۔

(6) اکبر، کلیات، جلد سوم، ص 157۔

(7) "کلیاتِ اکبر"، جلد اول، الٰہ آباد، اسرار کریمی پریس، ص-8/207۔

(8) اکبر کے یہاں مذہبی طور طریق میں بھی تضاد کو انگیز کرنے کی کچھ ایسی ہی ادا پائی جاتی ہے۔ وہ خود راسخ العقیدہ سنی تھے، لیکن ان کی دوسری بیوی، جن کی محبت نے ان سے پہلی بیوی چھڑا دی، شیعہ تھیں۔ لیکن عمر کے ساتھ اکبر کے مزاج میں تشیع کے خلاف تعصب بھی بڑھتا گیا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اکبر نے عشرت حسین کی شادی ایک شیخ زادے کی بیٹی سے کی۔ شیخ صاحب اصلاً سنی تھے، لیکن شیعہ بیوی کر کے خود بھی شیعہ ہو گئے تھے۔ اکبر کے مذہبی معاملات کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ ایک زمانے میں مشہور ہوا کہ عشرت حسین نے شیعیت اختیار کر لی ہے۔ اکبر کو اس بات پر بڑا تردد ہوا اور انھوں نے سر شاہ محمد سلیمان سے کہا کہ عشرت حسین کو تشیع کی طرف مائل ہونے سے روکیے۔ لیکن شاہ صاحب نے گول مول سا جواب دیا کہ آپ یہ معاملہ عشرت حسین کی موجودگی میں اٹھائیں تو میں ضرور کہوں گا۔ اکبر چاہتے تھے کہ عشرت حسین کے ایک بیٹے محمد عقیل کی تعلیم ندوۃ العلما، لکھنؤ میں ہو۔ لیکن یہ بیل شاید منڈھے چڑھی نہیں۔ ملاحظہ ہو "بزمِ اکبر" از قمر الدین احمد بدایونی، دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، 1940، ص 161,27,25 اور "رقعاتِ اکبر"، ص 24-25

(9) "کلیاتِ اکبر"، جلد دوم، لکھنؤ، ادبی پریس، 1931، ص-30

(10) کلیات، جلد اول، ص-2/161

(11) کلیات، جلد اول، صفحہ-1

(12) کلیات، جلد اول، صفحہ-199

(13) ملاحظہ ہو اسلوب احمد انصاری کی مرتب کردہ کتاب Sir Syed Ahmad Khan, A Centenary Tribute (Delhi, Adam Publications 2001, میں ڈیوڈ لیلی ولڈ (David Lelyveld) کا مضمون بعنوان Macaulay's Curse: Sir Syed and Syed Mahmood۔ ویسے یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ سید محمود کو انگریزی زبان پر اس درجہ قدرت تھی کہ انگریز بھی رشک کرتے تھے۔

(14) کلیات، جلد اول، ص-185

(15) یہ شعر قمر الدین احمد بدایونی کی "بزمِ اکبر" کے صفحہ 158 پر درج ہے۔ اکبر نے اسے کلیات میں نہ شامل کیا۔ وجہ ظاہر ہے۔ لیکن یہ ان کے مشہور ترین اشعار میں ہے۔

(16) "بزمِ اکبر" ص-64۔ یہ شعر بھی کلیات میں نہیں ہے۔

(17) "گاندھی نامہ"، ص-45، شعر کا متن کچھ غلط چھپا ہے۔ میں نے قیاسی تصحیح کی ہے۔ اس شعر کے حوالے سے مولانا محمد علی کا ذکر "بزمِ اکبر" کے صفحہ 64 تا 65 پر ملاحظہ ہو۔

(18) "بزمِ اکبر"، ص 146، 163 تا 164 اور حاشیہ، ص-164

(19) "گاندھی نامہ"، ص-1

(20) کلیات، جلد دوم، ص-63

(21) کلیات، جلد دوم، ص-68

(22) کلیات، جلد دوم، ص-15

(23) کلیات، جلد دوم، ص-54

(24) کلیات، جلد دوم، ص-94

(25) کلیات، جلد اوّل، ص-255

(26) کلیات، جلد سوم، ص-84

(27) کلیات، جلد سوم، ص-19

(28) کلیات، جلد دوم، ص-12

(29) کلیات، جلد دوم، ص-85

(30) کلیات جلد سوم، ص-13

(31) "غالب کے خطوط"، مرتبہ خلیق انجم، جلد دوم، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 1985، ص-524

(32) "بزمِ اکبر"، ص 132-133، اکبر کا شعر کلیات، جلد سوم، ص-42 پر ہے اور اپنا جو مصرع انھوں نے بڑھاوہ کلیات، جلد سوم، ص-130 پر دیکھا جا سکتا ہے۔

(33) ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ 1327 میں جب محمد تغلق نے دولت آباد کو اپنے دوسرے دار الخلافہ کے طور پر آباد کیا تو اس کا حکم ہوا کہ گنگا کا پانی میرے لیے ہر روز شمالی ہند سے لایا جائے۔ یہ چالیس دن کی مسافت تھی۔ ملاحظہ ہو: Ibn-e Battuta: The Rehla, Translated by Agha Mehdi Husain, Baroda, The Oriental Institute, 1953, p.4.

(34) ابوالفضل لکھتا ہے: "قیام ہو یا سفر، اعلا حضرت صرف گنگا کا پانی پیتے ہیں..... کھانا پکانے کے لیے جمنا اور چناب کا پانی تھوڑے سے بارش کے پانی اور گنگا کے پانی میں ملا کر استعمال کیا جاتا ہے۔" ملاحظہ ہو، "آئین اکبری"، جلد اول، مرتبہ ایچ۔ بلاک مان، ص-52۔ یہ اقتباس میں نے شیریں موسوی کی کتاب Eposodes in the Life of Akbar: Contemporary Records and Reminiscences مطبوعہ نیشنل بک ٹرسٹ دہلی، 1998، ص-100 سے حاصل کیا ہے۔ اس کے حوالے اور ابن بطوطہ کے بھی حوالے کے لیے میں پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی (الٰہ آباد یونیورسٹی) کا ممنون ہوں۔

(35) ملاحظہ ہو: Environment and Pollution in Mughal India از ایم افضال خاں، مطبوعہ Islamic Culture, Vol. LXXVI, January, 2002, pp.104-105. اس حوالے کے لیے بھی نعیم الرحمٰن فاروقی کا شکر گزار ہوں۔

(36) (1) مکتوب مورخہ فروری 1860 بنام حکیم غلام نجف خان،
(2) مکتوب مورخہ فروری 1860 بنام میر مہدی مجروح۔ ملاحظہ ہو، خلیق انجم، "غالب کے خطوط" جلد دوم، ص-630 اور 517

(37) مکتوب مورخہ 8 اگست، 1858۔ ملاحظہ ہو "غالب کے خطوط"، جلد اول، مرتبہ خلیق انجم، ص-292

(38) بنام میر مہدی مجروح "غالب کے خطوط"، جلد دوم، مرتبہ خلیق انجم، ص-521

(39) مکتوب مورخہ 8 مئی، 1864۔ ملاحظہ ہو۔ خلیق انجم، "غالب کے خطوط"، جلد چہارم، ص 1511۔ یہ دھیان میں رہے کہ پریس میں ملازم خطاطوں کو غالب نے مسلسل "کاپی نگار" کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ انھیں "کاتب" نہ قرار دیتے تھے۔ چہ جائے کہ اس قسم کے فن کار اور خطاط جیسے خود ان کے کاتب نواب فخر الدین خان تھے۔ ملحوظ رہے کہ قبل جدید ہندستان میں خطاطی کو فن شریف قرار دیتے تھے اور خود بہادر شاہ ظفر بے حد عمدہ خطاط تھے۔

(40) کلیات، جلد سوم، ص-21

(41) کلیات، جلد سوم، ص-10

(42) کلیات، جلد سوم، ص-17

(43) کلیات، جلد دوم، ص-62

(44) کلیات، جلد اول، ص-254

(45) کلیات، جلد اول، ص-68

(46) کلیات، جلد اوّل، ص-226

(47) صدیق الرحمٰن قدوائی، "انتخاب اکبر الٰہ آبادی"، مکتبہ جامعہ، 1984، ص-153۔

(48) رتن ناتھ سرشار، "فسانہ آزاد"، جلد اول، دہلی، قومی اردو کونسل، ص-15 [اول اشاعت 1880]۔

(49) "فسانہ آزاد"، جلد اول، ص-183

(50) مکتوب مورخہ 9 فروری، 1913۔ ملاحظہ ہو "رقعات" مرتبہ ساحل احمد، ص-126

(51) کلیات، جلد سوم، ص-8

(52) کلیات، جلد دوم، ص-56

(53) اس شعر کے مصنف کے بارے میں اکثر بحث رہی ہے۔ بہت سے لوگ اسے مومن کا کلام سمجھتے ہیں، لیکن مومن کے کلیات میں اس کا پتہ نہیں۔ عرش گیاوی نے لکھا ہے کہ پیش مصرع میر حسین تسکین کا کہا ہوا ہے۔ لیکن وہ اس پر مصرع نہ لگا سکے تو تھک ہار کر مومن کے پاس آئے۔ مومن نے فی البدیہہ مصرع لگا دیا اور شعر زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ ملاحظہ ہو عرش گیاوی: "حیات مومن"، ص-40، اول مطبوعہ 1929/1928۔ میرے سامنے اس کا فوٹو ایڈیشن ہے جو فرمان فتح پوری نے "نگار پاکستان" کے ایک نمبر کے طور پر اگست-1990 میں شائع کیا تھا۔

(54) کلیات، جلد اول، ص-251

(55) کلیات، جلد اوّل، ص-254

(56) کلیات، جلد اول، ص-342

(57) کلیات، جلد اول، ص-104

(58) آل احمد سرور نے اکبر کی فنی چابک دستی اور زبان کے صناعانہ استعمال کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اور کچھ نہیں تو یہی خوبیاں اکبر کے کلام کے پڑھے جانے کا جواز ہیں۔ ملاحظہ ہو ان کا مضمون "اکبر کی معنویت"، مشمولہ "کچھ خطبے کچھ مقالے"، علی گڑھ-1996، ص 70-71

(59) کلیات، جلد دوم، ص-46

(60) کلیات، جلد دوم، ص-98

(61) اقبال کی اسرار و رموز کا انگریزی ترجمہ (از نکلسن) انگلستان میں بہت مقبول ہوا تھا۔ اس پر اکبر نے شیخ عبدالقادر کو لکھا (21 اپریل، 1921):

میں اقبال صاحب کی قدر اس سبب سے نہیں کرتا کہ دربار لندن میں وہ مقبول ہیں

طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی نگاہ کا
سودا نہیں ہے مجھ کو حریفوں کی واہ کا

ملاحظہ ہو "رقعات"، ص-115-116۔ اکبر کا شعر مجھے کلیات میں نہ ملا۔

(62) "رقعات"، ص-144-190

(63) "رقعات"، ص-119

(64) "رقعات"، ص-36-37۔ شعر کے لیے دیکھیے، کلیات، جلد دوم، ص-83

(65) ملاحظہ ہو صدیق الرحمٰن قدوائی: Poet Who Laughed in Pain, Christine of Clowns and Gods, Brahmans and Bahus, Ed., Oesterheld and C.P. Zoller, New Delhi, Manohar, 1999, pp.83-84

(66) رالف رسل: Hidden in the Lute نئی دہلی، 1995، ص-200

(67) رالف رسل اور خورشید الاسلام: The Satirical Verse of Akbar Ilahabadi مضمون مشمولہ The Pursuit of Urdu Literature, A Select History, London, Zed Books, 1992, p.175

(68) کلیات جلد سوم، ص-140-141

(69) دیوان حافظ، مطبوعہ تہران، شرکت نسبی کانون کتاب، 1328 [=1949]، ص-27

(70) "بزم اکبر"، ص-165

(71) "بزم اکبر"، ص-217-218

(72) کلیات، جلد دوم، ص-48

(دوسری اور آخری قسط)

(بشکریہ "شب خون"، الٰہ آباد، جولائی 2002)

□□□

رفعت سروش

ایک اور دوست راہیِ ملکِ عدم ہوا

(بیادِ جگن ناتھ آزاد، 1918-2004)

چند روز پیشتر جگن ناتھ آزاد کی موت نے سردار جعفری، کیفی اعظمی اور مجروح سلطان پوری کی جدائی کے زخم تازہ کر دیے۔ وہ اس قبیلے کے آخری شاعر تھے جن کے یہاں انسان دوستی، رواداری، بین الاقوامی مسائل سے دلچسپی، زندگی کی مثبت قدروں کا احترام اور اعلا اخلاقی اقدار کے فروغ کا رویہ، اردو اور فارسی کے کلاسیکل ادب سے کماحقہٗ واقفیت، محاسنِ ادب پر گہری نظر اور ادب میں کمٹمنٹ پر ایمان تھا۔ آزاد کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوسکتا، کیونکہ اب ادبی تربیت کا وہ سانچہ ہی ٹوٹ گیا جو ایسے باکمالوں کو پیدا کرتا تھا۔

ہم جن لوگوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے ہیں، ان سے اتفاق اور اختلاف کرتے ہیں، بحث و مباحثہ کرتے ہیں، ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے ہیں اور جن کا ساتھ معمولاتِ زندگی کا ایک حصہ ہوتا ہے، ان کی عظمت کا احساس ان سے بچھڑ جانے کے بعد ہی ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ کیسا باکمال شخص ہم سے جدا ہوگیا اور اب وہ ہم سے کبھی ہم کلام نہ ہوگا، کبھی ہم نوالہ و ہم پیالہ نہ ہوگا۔ اب ہمیشہ کے لیے ہمارے کان اس کے قہقہے سننے سے محروم ہوگئے۔

ابھی ایک ڈیڑھ مہینے پہلے کی بات ہے۔ جگن ناتھ آزاد کا فون آیا کہ گھر پر ہی ہو؟ میں نے کہا— ہاں— اور ذرا دیر میں آزاد صاحب نے اپنی مسکراہٹ کے ساتھ غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا۔ حسبِ دستور بڑے تپاک سے گلے ملے۔ مجھے اچھی خاصی حالت میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، کیونکہ انھیں علم تھا کہ میں ''کینسر زدہ'' ہوں۔ میں نے کہا۔ چھ کیموتھراپی کا کورس پورا ہو چکا ہے۔ اور اس کے بعد پھر جانچ کی جا چکی ہے اور ڈاکٹروں نے مجھے خطرے سے باہر قرار دیا ہے۔ میری ہمت کی داد دیتے ہوئے اپنے بارے میں بتایا کہ مجھے تو ڈاکٹروں نے کمزوری کے باعث کیموتھراپی کا کورس نہیں دیا۔ البتہ ریڈیو تھراپی چل رہی ہے اور پہلے سے بہتر ہوں۔ (مجھے معلوم تھا وہ بھی کینسر کے مریض ہیں) اس روز وہ کافی کمزور نظر آئے۔ مگر مزاج میں شگفتگی تھی، اور مرض کی ہیبت ان پر طاری تھی۔ مجھے 'اقبال سمان' کی مبارکباد دی اور بھوپال میں منعقدہ جیوری کی میٹنگ کے قصے سناتے رہے۔ ہم دیر تک پرانے دوستوں کو یاد کرتے رہے۔ گویا ''محفلِ رفتگاں'' برپا رہی۔ بس آزاد سے یہ آخری ملاقات تھی۔ آخری بار ہم دونوں گلے ملے۔ آزاد کے سینے کا لمس میں آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔

آزاد صاحب کی ابتدائی زندگی راولپنڈی اور لاہور میں گزری اور میں دہلی اور پھر ممبئی رہا۔ اس لیے بالمشافہ ملاقات تو بہت بعد میں ہوئی جب میں جشنِ جمہوریہ کے پہلے مشاعرے میں ممبئی سے دلّی آیا۔ آزاد اس وقت رسالہ ''آجکل'' کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ مجھے آزاد کے کلام کو غور و خوض سے پڑھنے کا موقع ملا 1946 میں جب میں آل انڈیا ریڈیو ممبئی کے ہندستانی سیکشن میں ملازم ہوا۔ گانے والے آرٹسٹوں کے لیے مناسب کلام کے انتخاب کی ذمے داری اسٹیشن ڈائرکٹر ذوالفقار بخاری نے میرے سپرد کی تھی۔ اس زمانے میں ہرکس و ناکس کا کلام ریڈیو پر نہیں گوایا جاتا تھا۔ ہر اسٹیشن اپنے زون کے شعرا کے ساتھ رائلٹی پیش کرنے کا معاہدہ کرتا تھا اور یہ معاہدہ بہت چھان پھٹک کے بعد کیا جاتا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو لاہور کے جن شاعروں کا کلام منظور شدہ فائل میں تھا ان میں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، عابد علی عابد اور جگن ناتھ آزاد۔ اور دو ایک نام اور تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے آزاد سے ذہنی قربت حاصل کی۔ آزاد اس زمانے میں صحافت میں تھے۔ ''ادبی دنیا'' (ماہنامہ) سے بھی ان کا تعلق تھا اور ایک کانگریسی اخبار ''جے ہند'' کے ایڈیٹر تھے۔ ان کے کلام میں پختگی تھی، نغمگی تھی اور ہمارے میوزک آرٹسٹ ان کی غزل گانا پسند کرتے تھے۔

وقت گزرا۔ ملک تقسیم ہوا۔ آزاد کا ارادہ پاکستان ہی رہنے کا تھا۔ چنانچہ انھوں نے پاکستان کا پہلا قومی نغمہ کہا، جو 14 راگست 1947 کو اعلانِ آزادی کے ساتھ ریڈیو پاکستان (لاہور) سے نشر ہوا۔ اس کا مکھڑا یہ تھا:

ذرّے ترے ہیں آج ستاروں سے تابناک
اے سرزمینِ پاک

لیکن مذہبی فرقہ پرستی کے جنون نے آزاد کو بے بس کر دیا۔ وہ ایک بار ستمبر 1947 میں دلّی آئے اور واپس لاہور چلے گئے۔ بالآخر اکتوبر 1947 میں وہ حتمی طور پر لاہور سے دلّی آگئے۔ پاکستان کو خیرباد کہا اور ہندستانی شہری ہوگئے۔ ازسرِ نو جدوجہد کی اور آخرکار ''آجکل'' میں ٹھکانے کی ملازمت مل گئی۔

''15 راگست 1947'' کے عنوان سے آزاد نے جو غزلِ مسلسل لکھی ہے وہ اس ہولناک ٹریجڈی کی عکاسی کرتی ہے جو سانحۂ تقسیم کی وجہ سے ہوئی۔ اس غزل کے ذکر کے ساتھ ذہن تقریباً دو سال قبل اس تاریخی ٹریجڈی کی طرف جاتا ہے جب 1757 میں پلاسی کی جنگ میں انگریزوں نے سراج الدولہ کو شکست دی تھی اور جس کے باعث تاریخ کا دھارا مڑ گیا تھا۔ اس لیے

کے متعلق راجہ رام نرائن موزوں کا بیحد مشہور شعر ہے:

غزالاں تم تو واقف ہو، کہو مجنوں کے مرنے کی
دِوانہ مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری

آزاد کے زرخیز کلاسیکل ذہن نے تقسیم وطن کی ٹریجڈی پر جو غزل کہی اس کے فکری ڈانڈے موزوں سے مل جاتے ہیں۔ آزاد نے قافیہ بدل کر کبھی نہ بھلائے جانے والی غزل کہی۔ اس غزل کا استعاراتی اہتمام قابلِ داد ہے:

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری
بہار آتے ہی ٹکرانے لگے کیوں ساغر و مینا
بتا اے پیرِ میخانہ کہ میخانوں پہ کیا گزری
کہو دیر و حرم والو! یہ تم نے کیا فسوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گزری

اور اس غزل کے ذکر کے ساتھ ہی اس غزل کا ذکر بھی ناگزیر ہے جو آزاد نے ہندستان سے پہلی بار پاکستان کے مشاعرے میں شرکت کے وقت پڑھی۔ اس میں آزاد کا ہی نہیں، اس دَور کا کرب سمٹ آیا ہے:

تری بزمِ طرب میں رازِ پنہاں لے کے آیا ہوں
چمن میں یادِ ایّامِ بہاراں لے کے آیا ہوں
میں اپنے گھر میں آیا ہوں، مگر انداز تو دیکھو
کہ اپنے آپ کو مانندِ مہماں لے کے آیا ہوں
تمھارے واسطے اے دوستو! میں اور کیا لاتا
وطن کی صبح تک شامِ غریباں لے کے آیا ہوں

آزاد بڑے خوش مزاج، متواضع اور نیک دل انسان تھے۔ کھل کر ملتے تھے، کھل کر باتیں کرتے تھے، کھل کر قہقہے لگاتے تھے، اور ان کے مزاج میں بھی ایک عجیب قسم کا توازن ہوتا تھا۔ میں 1958 کے آخر میں ممبئی سے دلّی ریڈیو اسٹیشن پر آیا تھا۔ ان دنوں پی آئی بی میں آزاد انفارمیشن آفیسر تھے۔ اور ہمارا دفتر ایک ہی بلڈنگ میں تھا۔ اس لیے آزاد سے ہر تیسرے دن ملاقاتیں ہونے لگیں۔ کبھی کبھار ان کے دفتر میں بھی شعر وشاعری کا دَور چلتا اور وہ اکثر ہمارے اردو مجلس پروگرام میں کلام پڑھتے۔ جب آتے، ان کی شگفتہ مزاجی کی وجہ سے ایک بہار آجاتی۔ غلام ربانی تاباں سے ان کی بہت دوستی تھی اور کچھ عرصے کے لیے ڈی سی ایم کے مشاعرے کی مشاورتی کمیٹی میں تاباں، ممتاز مرزا، آزاد اور راقم الحروف تھے۔ بی بی ساہنی مشاعرے کے کنوینر ہوتے تھے۔ ان میٹنگوں میں آزاد کا رویہ بہت متوازن رہتا تھا۔ انھوں نے کبھی ''دوست نوازی'' نہیں کی۔ ایسے ہی شعرا کا نام پیش کیا جو اس مرتبے کے ہوں کہ انھیں ڈی سی ایم کے مشاعرے میں بلایا جاسکے۔ ساہنی صاحب اپنے گھر پر مشاعرے کے اہتمام کے سلسلے میں اکثر ''رنگین دعوتیں'' کرتے تھے۔ ان دعوتوں میں آزاد کو میں نے کبھی حد سے تجاوز کرتے نہیں دیکھا۔ وہ بہ قدرِ ظرف ہی شوق کرتے تھے جس سے ان کے مزاج کی شگفتگی اور بڑھ جاتی تھی۔ ان کے ساتھ نہ جانے کتنی محفلوں میں ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہوا۔ میں نے آزاد کو کبھی مغلوب الغضب ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ کئی سال لال قلعے کے یومِ جمہوریہ کے مشاعرے کے بھی کنوینر رہے۔ لال قلعے کے ایک مشاعرے کی بات یاد آئی۔ 1969 میں یومِ غالب کا مشاعرہ تھا۔ میں نے تازہ طرحی غزل کہی تھی اس لیے زبانی یاد نہیں تھی۔ اور کاغذ ہاتھ میں تھا۔ پڑھتے پڑھتے میں نے اتفاق سے اپنا ہاتھ پیچھے کیا اور آزاد نے محض شرارت میں غزل کا پرچہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ مگر آزاد نے دھیرے سے اگلے شعر کا پہلا لفظ مجھے بتا دیا اور میری جان میں جان آئی۔ وہ شعر اب تک یاد ہے اور اس پر بہت داد ملی تھی۔ اگر ذرا چوک ہوجاتی تو پانسہ اُلٹا پڑ جاتا۔ شعر یہ ہے:

قلعۂ سرخ کی دیوارو کوئی بات کرو
تم نے تو دیکھا ہے غالب کا غزل خواں ہونا

آزاد یاروں کے یار تھے۔ ان کی یہ بذلہ سنجی بے تکلف دوستوں تک ہی محدود تھی۔ عام طور پر وہ بہت سنجیدہ اور فلسفی قسم کے انسان نظر آتے تھے۔ ہمیشہ انگریزی لباس ہی پہنتے تھے اور خوش لباس تھے۔ بغیر ٹائی کے کوٹ کبھی نہیں پہنتے تھے۔ مشاعروں میں بہت سے شعرا نخرے بہت کرتے ہیں۔ مشاعرے سے قبل شاعروں کے نخرے دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ شراب کی مانگ کررہے ہیں، کھانے میں عیب نکال رہے ہیں، مگر آزاد بڑے شاعر ضرور تھے، مگر ''بڑے شاعروں'' والی یہ صفات ان میں نہیں تھی۔ آس پاس کے مشاعروں میں ہم لوگ ساتھ ہی مشاعروں میں جایا کرتے تھے۔ ان کا ایک جملہ مجھے ہمیشہ یاد آتا ہے۔ ''یار! مشاعرے کی آمدنی سے بہتر اور کوئی آمدنی نہیں۔ اِدھر شعر پڑھو، اُدھر پیسے لو''۔ مشاعروں میں معاوضے پر وہ جھگڑا کبھی نہیں کرتے تھے۔ جو کچھ شروع میں طے ہوگیا، وہ وصول کیا اور خاموشی سے جیب میں رکھ لیا۔ اس کے برعکس بعض کئی ''بڑے شاعروں'' کے بارے میں مشہور تھا کہ معاوضوں کی رقم پر میزبان سے جھگڑا ضرور کریں گے۔ ''آپ نے یہ لکھا تھا'' ''مگر میں نے تو آپ کو یہ لکھا تھا''۔ ''لیکن ہم نے اسے منظور تو نہیں کیا تھا''۔ ''نہیں جناب! آپ کو یہ رقم دینی پڑے گی، آپ کا دوسرا خط نہیں ملا''۔ اس طرح کی جرح کرنے والے اکثر وہ شعرا ہوتے ہیں جن کا ذریعۂ معاش ہی مشاعرہ پڑھنا ہوتا ہے۔ بات طے ہو نہ ہو، مشاعرے میں پہنچ جائیں گے۔ پھر بحث مباحثے کے بعد جتنا کچھ میزبان کی جیب سے گھسیٹ سکیں، گھسیٹ لیں گے۔ جو شعرا برسرِ روزگار ہیں اور جن کے روزمرّہ کے اخراجات مشاعرے کی آمدنی کے بغیر بھی چل سکتے ہیں، وہ اس طرح کی بحثوں سے دور رہتے ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد شاعر تو تھے ہی، اس کے علاوہ انھیں نثرنگاری پر

کافی قدرت تھی اور ظاہر ہے ان کی نثر کی وجہ سے ہی انھیں "ملاپ" کے رنبیر، "ادبی دنیا" کے صلاح الدین جیسے اپنے وقت کے جید صحافیوں نے انھیں اپنا اسسٹنٹ ایڈیٹر بنایا۔ نثر کے بارے میں ان کا ایک عجیب وغریب فقرہ ہے جو انھوں نے میری خودنوشت "بمبئی کی بزم آرائیاں" کے بارے میں مضمون لکھتے وقت قلم بند کیا۔

"شاعری تو خیر آج کے دَور میں "وزن" کی ضرورت سے بے نیاز ہوگئی ہے، لیکن نثر "وزن" کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہوئی اور میرا تو شروع سے یہ خیال ہے کہ نظم میں وزن برقرار رکھنا بڑی بات نہیں ہے، نثر میں وزن برقرار رکھنا بڑی بات ہے، رفعت سروش کی نثر میں یہ خصوصیت بدرجۂ اتم نظر آتی ہے۔ ("اپنی محفل اپنے دوست"، ص-146)

اسی مضمون میں انھوں نے مجھ سے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا ہے جو میرے لیے فخر کی بات ہے:

"میرا خیال تھا کہ رفعت سروش کے ساتھ میرے چالیس پینتالیس برس کے مراسم ہیں، اور میں ان کے بارے میں بہت کچھ یا کم از کم بہت کچھ جانتا ہوں۔ لیکن یہ کتاب پڑھی تو پتہ چلا کہ رفعت تو اس کتاب کی گہرائی میں پوشیدہ ہیں۔" (ص-148)

کہیں خودستائی نہ سمجھی جائے اس لیے اپنے بارے میں آزاد صاحب کی تحریر کے زیادہ اقتباسات نہیں پیش کر رہا ہوں۔ وہ مجھ سے چھ سال بڑے تھے، مگر عموماً یہ بُعد ہمارے تعلقات کی بے تکلفی میں حائل نہ تھا، مگر بہت سی باتیں 'ناگفتنی' بھی ہوتی ہیں۔

آزاد نے اپنا بہت سا شعری سرمایہ چھوڑا ہے، اگرچہ دوستوں اور یادداشتوں پر مبنی بہت سے مضامین ہیں، اس کے علاوہ ان کے سفرنامے ہیں، مختصر سی خودنوشت ہے، مگر ان کے نثری مضامین کا وقیع حصہ "اقبالیات" کے حوالے سے ان کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین پر بحیثیت "ماہر اقبالیات" کے آزاد کا مرتبہ عالمی ادب میں بہت بلند ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ لاہور میں رہنے کے باوجود آزاد کو کبھی اقبال سے ملنا نصیب نہیں ہوا، مگر ان کے فکر پر اقبالیات کی چھاپ ہے اور اس میں شک نہیں کہ کل کا مورخ آزاد کو اقبال کے حوالے سے یاد کرے گا۔ "اقبال اور آزاد" کے موضوع پر کئی ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ یاسمین کوثر کی کتاب "جگن ناتھ آزاد: بطور اقبال شناس" 2000 میں شائع ہوئی ہے، اور یہ صاحبہ پنجاب یونیورسٹی (اورینٹل کالج) لاہور (پاکستان) کی ایم اے کی طالبہ ہیں۔ یاسمین کوثر نے اقبال پر آزاد کے کام کو یکجا کر دیا ہے۔ آزاد کی پانچ کتابیں منظرِ عام پر آئیں۔ "اقبال اور اس کا عہد" (1960)، "اقبال اور مغربی مفکرین" (1976) اور "اقبال اور کشمیر" (1977) اس کے علاوہ اقبال کی شاعری اور فلسفے پر ان کی انگریزی تصنیف "Iqbal His Poetry and Philosophy" 1981 میں شائع ہوئی اور 1983 میں شائع ہوئی "Iqbal Mind"۔ ان مطبوعات کے علاوہ درجنوں مقالات جو ہنوز شائع نہیں ہو سکے ہیں۔

آزاد نے آزادی کے بعد اقبال کا ذکر پہلی بار اس وقت کیا جب سیاسی حالات کے باعث ہندستان میں اقبال سے بے توجہی برتی جا رہی تھی اور پھر تو جہاں جہاں اقبال کا ذکر ہے، اقبال پر کانفرنسیں ہیں، اقبال پر نمائش ہے، وہاں وہاں آزاد ہیں۔ سب سے زیادہ قابلِ تعریف کتاب "اقبال اور مغربی مفکرین" ہے جس کے ابواب سے ہی اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ آزاد نے کس طرح اقبال کو عالمی تناظر میں دیکھا اور پرکھا۔ ابواب کچھ اس طرح ہیں: "اقبال اور فکرِ یونان"، "اقبال اور جدید مغرب" (لینن، لاک اور کانٹ)، "اقبال اور شوپن ہار"، "اقبال اور کارل مارکس"، "اقبال اور نیٹشے"، "اقبال اور برگساں"، "اقبال اور دانتے"، "اقبال اور ملٹن"، "اقبال اور گوئٹے" اور "اقبال او رآئن اسٹائن"۔ گویا مغرب کے تمام فلسفیوں سے اقبال کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

اس مختصر مضمون میں صرف اجمالی تذکرہ ہی کیا جاسکتا ہے کہ پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی کن کن جہات پر غور وفکر کیا، لکھا اور بالخصوص موجودہ ہندستان اور یہاں کے دانشوروں کو اقبال شناسی کی طرف راغب کیا۔ اس ضمن میں اقبال اکادمی سمیت بہت سے ادارے وجود میں آئے۔ یاسمین کوثر نے اپنی کتاب میں اقبالیات پر آزاد کے غیر مدوّن مضامین کی فہرست درج کی ہے جن کی تعداد 92 ہے۔

اقبال شناسی جگن ناتھ آزاد کی علمی زندگی کا ایک پہلو ہے مگر ان کے یہاں اوّلیت ان کی شاعری کو ہی رہی اور ہر دَور میں، اور آخر تک شعر کہتے رہے۔ ان کی غزل گوئی کا ذکر تو ابتدا میں آ گیا ہے، لیکن ان کی نظمیہ شاعری کا تذکرہ ابھی باقی ہے۔ میرا خیال ہے آزاد اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک کلاسیکل مزاج کے غزل گو شاعر ہیں اور جو نظمیں انھوں نے کہی ہیں وہ تعداد میں کافی ہونے کے بعد ان کی غزلیہ شاعری کے مقابلے میں ہلکی ہیں۔ ان کی وارداتِ قلبی اور داخلیت سے مملو شاعری صنفِ غزل میں ہی ہے۔ نظمیں زیادہ تر بیانیہ ہیں جو زیادہ تر مختلف سیاسی اور ادبی شخصیات کے بارے میں منظوم خراجِ عقیدت ہیں۔ ان میں محاسنِ شاعری موجود ہیں، مگر ایسی شاعری ابھری ہوتی ہے۔ کچھ نسبتاً طویل نظمیں "اجنتا"، "جامع مسجد" اور "اردو" پر ہیں۔ ایک طویل نظم "ہندوستانی مسلمان" بھی قابلِ ذکر ہے۔ "سبھاش چندربوس: بہادر شاہ ظفر کے مزار پر" ایک خوبصورت نظم ہے جس میں ان کی غزل کا رنگ ہے:

گردشِ تقدیر کے ہاتھوں وطن سے دُور ہوں
ایک بلبل ہوں مگر صحنِ چمن سے دُور ہوں
میں بھی ہوں اپنے وطن سے دُور تُو بھی دور ہے
ہاں رضائے پاکِ یزداں کو یہی منظور ہے

میں نے بھی تلوار اُٹھائی ہے تری تقلید میں
اور لاتعداد بازو ہیں مری تائید میں
میرا دامن بھی یہاں کی خاک سے آلودہ ہے
فرق صرف اتنا ہے میں آوارہ تُو آسودہ ہے

صوتی اعتبار سے ہر نظم اقبال کی یاد دلاتی ہے۔

ان کی کتاب ''بوئے رمیدہ'' میں کئی نظمیں کسی پیکرِ رعنا کی خوشبو میں بھی ہوئی ہیں:

میں یوں دکن سے دادِ سخن پا کے آگیا
دل پر اِک اور تیرِ نظر کھا کے آگیا
گفتار تھی کہ نغمۂ یاراں کا زیر و بم
رفتار تھی کہ جس پہ فدا بادِ صبح دم
کچھ مسکرا کے جھک کے ذرا سا حیا کے ساتھ
اس نے مجھے سلام کیا کس ادا کے ساتھ

اس شعر میں حسینانِ حیدرآباد کے اندازِ سلام کی پیکر تراشی کی گئی ہے۔

ان نظموں کو پڑھ کر مجاز کی عشقیہ نظمیں یاد آتی ہیں۔ اور ایک کردار اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ ''کل رات کو''، ''تیرے شہر میں''، ''جہاں میں تھا''، ''میں نے لکھا تھا'' ہلکی پھلکی رومانی نظمیں ہیں۔۔ ''نرگسِ بیمار'' میں اس پیکرِ رعنا کا اَتا پتہ بھی مل جاتا ہے:

دکن سے یہ خبر دوشِ فضا پہ آج آئی ہے
ادائے نازاں آنکھوں پہ علالت بن کے چھائی ہے

اس قبیل کی تمام نظموں اور غزلوں میں 'دکن' کی رعایت سے اشعار پڑھنے کے بعد صرف ایک 'مجلسی افسانے' کا کردار سامنے آتا ہے کہ شاعر حیدرآباد میں ایک خوش جمال، خوش مزاج قدردانِ سخن سے ملا۔ اس سوشل ملاقاتوں اور دوستوں سے متعلق نظموں میں وہ تاثر آ ہی نہیں سکتا جو رومانی جمالیاتی اور والہانہ عشقیہ شاعری سے عبارت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس آزاد نے اپنی پہلی بیوی شکنتلا کی بیماری، کسولی میں ان کے مرضِ ٹی بی کا علاج اور آخر کار موت سے ہم کنار ہونے کی داستان و کیفیات ''بکھراں'' کی چند نظموں میں رقم کی ہے۔ ان نظموں کو شخصی مرثیوں میں مناسب مقام ملنا چاہیے۔ شاعر ''کسولی'' کے صحت افزا درختوں سے مخاطب ہے:

اے درختو! میں تو سمجھا تھا کہ تم جھومو گے جب
ایک مرجھائی ہوئی پتی کا منہ چوموگے جب
وہ تمھارے لمس سے اِک شادمانی پائے گی
شادمانی سے سرورِ زندگانی پائے گی
مجھ کو کیا معلوم تھا تم درد سے بیگانہ ہو
اپنی ہی دُنیا میں گم ہو، درد سے بیگانہ ہو

اور بیوی کو سپردِ آتش کرنے کے بعد عالمِ وارفتگی میں اس سے مخاطب ہیں:

جب چتا کی لکڑیوں پر سو گیا تیرا شباب
کچھ نظر آیا نہ جز یک شعلۂ پُر پیچ و تاب
شمع تک ہی میں نے یہ دیکھا کہ پروانہ گیا
دُور تک گو جستجو میں تیرا دیوانہ گیا

شکنتلا کی موت پر آزاد نے خون کے آنسو بہائے ہیں۔

آزاد کے شعری سرمائے پر نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ غزل کے روایتی اسلوب کے پاسدار ہیں۔ ان کے یہاں تجربات کی ایک کہکشار ہے، وجدانی کیفیات ہیں اور رُوحانی اور جمالیاتی تجربے ہیں۔ کچھ اشعار:

جب جوشِ جنوں ہو گرم سفر وہ بندِ سلاسل کیا جانے
طوفان جب اپنی موج میں ہو پابندئ ساحل کیا جانے

مری حدِ نظر ہے اور میں ہوں
فریب رہگذر ہے اور میں ہوں

جو تھا دِل کا ورد چلا گیا، ہے نظر میں اب بھی وہ انجمن
وہ خیال دوست چمن چمن، وہ جمالِ دوست بدن بدن

دامن کی ہوا یاد نہ زلفوں کی گھٹا یاد
اب کچھ بھی نہیں سوزِ غمِ دِل کے سوا یاد

خیالِ یار جب آتا ہے بیاکانہ آتا ہے
کہ جیسے شمع کی جانب کوئی پروانہ آتا ہے

یہ زمیں اور اس کی یہ وسعتیں نہ تری بنیں نہ مری بنیں
مگر اس پہ بھی ہے یہ ضد ہمیں یہ ترا وطن یہ مرا وطن

میں نے آزاد کی غزلوں کے مختلف رنگوں کے اشعار اس لیے پیش کیے ہیں تاکہ ان کے فکر و خیال کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ ہو سکے۔ ہر بڑے فنکار کی طرح آزاد کو بھی یہ خیال تھا کہ ابھی اہلِ دنیا نے اُن کی قدر نہیں جانی، ان کے بعد ان کی صحیح تفہیم ہو سکے گی۔ جس طرح غالب نے کہا تھا:

شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

اسی تصور کے ساتھ آزاد نے کہا:

مری شاعری ہے چھپی ہوئی مری زندگی کے حجاب میں
یہ حجاب اُٹھے تو عجب نہیں پڑے مجھ پہ بھی نگہِ وطن

اگرچہ جگن ناتھ آزاد کی زندگی میں ہی کم سے کم ایک درجن کتابیں ان کی شاعری اور اقبال شناسی پر شائع ہو چکی ہیں، مگر پھر بھی انھیں ناقدرئ فن کا احساس تھا۔ عجب نہیں کہ آزاد کی موت اُن کی ادبی کاوشوں کی حیاتِ ثانیہ کا آغاز ہو۔

A-80, Sector-27, Noida-201301

□□□

ابوالکلام قاسمی

''میں کیا میری حیات کیا'' کے امتیازات

گزشتہ دو تین دہائیوں میں ناول کے متوازی اردو میں خودنوشت سوانح نگاری کے فن کو خاصا عروج حاصل ہوا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خودنوشت کی صنف نے اردو فکشن کے مقابلے میں قدرے زیادہ مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ آپ بیتی کی اس مقبولیت میں مرکزی کردار کی حیثیت سے مصنف کی موجودگی کا احساس تو ایک جہت کا اضافہ کرتا ہی ہے، انسانی تجربے اور مشاہدے کی آنچ اس نوع کی تحریروں کو دوآتشہ بنا دیتی ہے۔ پھر یہ بھی ہوا ہے کہ خودنوشت کو ناول کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی بعض کوششوں نے بھی خودنوشت میں بعض فنی جہات کا اضافہ کر دیا ہے۔ اردو میں اس قسم کی سب سے نمایاں اور ممتاز کوشش قرۃ العین حیدر کے سوانحی ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' کے ذریعے سامنے آئی تھی جس میں مصنفہ نے اپنی آپ بیتی کو اپنے اجداد کی جگ بیتی کے ساتھ ہم آہنگ کر کے ایک سوانحی تحریر کو بڑا سیاق و سباق دینے کی طرف توجہ مبذول کی تھی۔ اردو میں سوانحی تحریروں کے معاملے میں قرۃ العین حیدر کے اس غیر معمولی کارنامے کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ تاہم اگر آپ بیتی سے فکشن کے پہلو کو الگ کر دیا جائے تو حقیقت کا ٹھوس تصور اور زندگی کا راست حوالہ بھی آپ بیتی میں ایک خاص طرح کی کشش کا اضافہ کر دیتا ہے۔ شاید اسی باعث قاری کے لیے کسی آپ بیتی کا مطالعہ زندگی گزارنے کے ہنر اور اس سے حاصل شدہ بصیرت سے آگاہی کا ذریعہ بھی بنتا ہے اور مصنف کے نقطۂ نظر کی شمولیت اسے مزید دلکش بھی بنا دیتی ہے۔ اس پس منظر میں پچھلے دنوں منظرِ عام پر آنے والی خودنوشت ''میں کیا میری حیات کیا'' کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ پروفیسر اطہر صدیقی کی اس خودنوشت سے ان کی اپنی ذات، خاندانی احوال و کوائف اور انسانی یا سماجی روابط کے ساتھ ایک بڑے تعلیمی اور تہذیبی ادارے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شب و روز اور اس ادارے کے حوالے سے اس میں جاری بعض سیاسی اور سماجی حرکیات (Dynamics) کا عرفان بھی حاصل ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو آپ بیتی میں سرد و گرم جنگ، چھوٹی چھوٹی مخاصموں اور تعریف و تنقید کے انسانی پہلوؤں پر زیادہ توجہ صرف کرتے ہیں۔ تاہم انسانی مراسم کی ظاہری آویزش اور کشمکش کو اگر بنیادی اہمیت نہ دی جائے اور اس کشمکش کو انسانی سماج میں جاری حرکیات اور اس سے مرتب ہونے والے نتائج پر نگاہ رکھی جائے تو اس قسم کی خودنوشت کو زیادہ بہتر سیاق و سباق میں سمجھا جا سکتا ہے۔

اطہر صدیقی کی آپ بیتی اگر صرف سطحی انداز میں واقعات کا بیان اور سرگزشت کی کھتونی ہوتی تو اسے نہ تو آپ بیتی کی حیثیت سے کوئی خاص اہمیت حاصل ہوتی اور نہ اس پر کسی سنجیدہ اظہارِ خیال کی ضرورت پیش آتی۔ دو حصوں پر مشتمل اس آپ بیتی کی پہلی جلد میں مصنف کی نجی اور ذاتی زندگی کے حوالے سے مختلف اشخاص، مقامات، اداروں اور تہذیبوں کا واقعیت پسندانہ مگر دور رس بیان شامل ہے اور دوسری جلد میں سفر نامے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بعض وائس چانسلرز کے خاکے اور مصنف کے نام آئے ہوئے کچھ اہم اور یادگار خطوط کو جگہ دی گئی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ گوناگوں پہلو خودنوشت کا حصہ بن گئے ہیں اور مصنف کے نقطۂ نظر سے ایک ایسا تناظر فراہم کرتے ہیں کہ اس کے باعث اس تحریر میں کیمپس ناول کی بہت سی خصوصیات شامل ہوگئی ہیں۔ یہ خودنوشت اپنی نوعیت اور پیش کش کے اعتبار سے ایک سوانحی ناول نہیں، لیکن اس کا مطالعہ کسی بھی وقیع ناول سے کسی طرح کم دلچسپ ثابت نہیں ہوتا۔ اس کتاب میں مصنف کی افتادِ طبع، پسند و ناپسند، مزاج کے تشکیلی عناصر اور ذہنی نشوونما کے تقریباً سارے عوامل ایک جگہ جمع ہو گئے ہیں۔ کتاب کے ابتدائی صفحات میں اردو کے سربرآوردہ ناول نگار قاضی عبدالستار کی تقریظ ''سرآغاز'' کے عنوان سے شامل ہے۔ وہ اسے ایک ممتاز آپ بیتی کا نام دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ''امتیازات کی نشاندہی کے بغیر ممتاز کا لفظ بے معنی اور بے آبرو ہے'' قاضی صاحب نے اپنی تحریر کو اپنے اس قول کا مصداق بنانے کی کوشش کی ہے اور 'خودنوشت' کے فن کے حدود کا تعین کرنے کے بعد اطہر صدیقی کی خودنوشت کی انفرادیت اور امتیازات کی مدلل نشاندہی کی ہے۔ انھوں نے اس کتاب کو خود پرستی اور خودستائی سے پاک بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ''اطہر صدیقی کے پاس خود پرستی اور خودستائی کے ڈھیروں مواقع تھے لیکن وہ اس پل صراط سے اس طرح کامران گزر گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے''۔ ممکن ہے اس بات میں صداقت ہو لیکن اس کی تصدیق کے لیے اس آپ بیتی کے اہم مشمولات پر ایک نگاہ ڈالنی زیادہ مناسب ہوگی۔

اطہر صدیقی نے اپنی آپ بیتی میں شعوری طور پر اس بات کا اہتمام کیا

ہے کہ ان کے بیانات سے کسی نوع کی خود مرکزیت کا تاثر نہ پیدا ہو۔ وہ واضح الفاظ میں نرگسیت سے اپنی برأت کا اظہار بھی کرتے ہیں اور بہ ظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ نرگسیت کے شکار لوگوں کو قابلِ رحم تصور کرتے ہیں۔ ان کے الفاظ ہیں کہ ''اکثر لوگ زندگی میں نرگسیت کے شکار نظر آتے ہیں اور اس کا اظہار اپنے گھر یا کمرے میں اپنی تصویریں سجا کر کرتے ہیں''۔ شاید اسی بات کو غالب نے نہایت بلیغ انداز میں کہا تھا کہ ''ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور'' ویسے راقم الحروف کی نگاہ میں کسی صاحبِ فہم اور صاحبِ اسلوب ادیب اور انشا پرداز کی سب سے بڑی قوت محرکہ اس کا متوازن احساسِ انا اور محدود نرگسیت ہی ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو وہ اپنی ذات یا اپنے تجربات و مشاہدات کی پیش کش کا کوئی جواز ہی فراہم نہ کر سکتا، خواہ وہ اپنی آپ بیتی کا نہایت منکسرانہ نام ''میں کیا میری حیات کیا؟'' ہی کیوں نہ رکھے۔ بس دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے احساسات اور تاثرات کو توازن سے ہم آہنگ کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے اور اس کے اندر موجود قوتِ ممیّزہ نے زندگی کے افراط و تفریط کو کس حد تک اعتدال کے مراحل سے گزارا ہے۔ اطہر صدیقی کی شخصیت میں اس طرح کی محرک قوتِ تخلیق پوری طرح موجود ہے مگر وہ اکثر مقامات پر اپنے مزاج کی افراط و تفریط کو اپنی عقلِ سلیم کا تابع رکھنے پر بھی قادر نظر آتے ہیں۔ تفاخر ایک چیز ہوتی ہے اور تحدیثِ نعمت دوسری چیز۔ ایک کا حوالہ منفی ہے اور دوسرے کا مثبت۔ زیرِ نظر کتاب میں تحدیثِ نعمت کے بہت سے مواقع آئے ہیں مگر وہ کہیں بھی آپے سے باہر ہوتے ہوئے نہیں دکھائی دیتے۔ وہ بجا طور پر اپنی ذہنی سطح کا ذکر کرتے ہیں مگر ان کا پیرایہ ایسا دلچسپ اور فطری ہوتا ہے کہ اس سے احساسِ تفاخر مترشح نہیں ہوتا۔ ایک جگہ وہ اپنی بیگم کے دانش مندانہ رویے کا ذکر کرتے ہوئے یہ لکھنے میں بھی تکلف نہیں محسوس کرتے کہ ''ذکیہ پندرہ سال میری معیت میں رہ کر خاصی بالغ نظر ہو گئی تھیں''۔ اس قسم کے بیانات ہمارے سماج میں رائج 'کبر آمیز انکساری' کے اظہار سے تو کہیں بہتر ہیں، کہ ان سے کسی نفسیاتی پیچیدگی کا اظہار تو نہیں ہوتا۔

'میں کیا میری حیات کیا؟' کی پہلی جلد مختلف ابواب پر مشتمل ہے، ہر باب کا تعین کسی مخصوص پہلو کی نشاندہی پر مبنی ہے۔ اگر ایک باب میں اپنے بچپن، لڑکپن اور ابتدائی زمانے کی صورتِ حال کا احاطہ کیا گیا ہے تو دوسرے باب میں طالب علمی کے زمانے کے نشیب و فراز اور عسرت و جدوجہد کا ذکر ملتا ہے۔ کسی باب میں اپنی ملازمت اور اس کے مسائل کا بیان ہے تو کسی باب میں اعلا تعلیم کے سلسلے میں غیر ممالک کے دوروں اور ان سے متعلق علمی اور تہذیبی صورتِ حال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کوئی باب درس و تدریس کے کسی مخصوص دور پر مشتمل ہے تو کسی باب میں علی گڑھ اور بیرونی ممالک کی بعض درسگاہوں کی تعلیمی اور انتظامی زندگی کا تقابل اور موازنہ سامنے لایا گیا ہے۔ غرض یہ کہ کتاب کی ابواب سازی اپنے آپ میں مصنف کی ذہنی ضابطہ بندی اور کتاب کے پورے خاکے کی منصوبہ بندی کی نمائندگی کرتی ہے۔ اطہر صدیقی چونکہ علمی مہارت اور پیشے کے اعتبار سے ایک سائنس داں اور حیاتیات کے ایک مخصوص شعبۂ تخصص 'طفیلیات' کے محقق رہے ہیں اس لیے علمی اور تحقیقی طفیلیوں پر بھی ان کی نگاہ بڑی گہرائی سے پڑتی ہے۔ اپنی ملازمت کے دوران اپنے منصبی فرائض کے ضمن میں انھوں نے جہاں اعلا درجے کے استاذ ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے وہیں انتظام و انصرام اور تقررات کا بھی وہ ایک طویل تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کے دیکھتے دیکھتے حاشیے پر موجود بعض افراد نے کس طرح مرکزی اہمیت حاصل کر لی اور کیوں کر ان جیسے منہمک محققوں کو علمی طفیلیوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے عرصے تک اپنے حق سے محروم رکھا گیا، اس کا تجزیاتی بیان زیرِ نظر آپ بیتی میں موجود ہے۔ ایسا سحر آفریں بیان کہ اس سے بصیرت کے ساتھ عبرت بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔ اپنی اعلیٰ تعلیم کے دوران امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں تعلیم اور رہائش کا تجربہ ان کے لیے محض یادوں کی بازیافت نہیں بلکہ وہ مشرق و مغرب کا موازنہ اور امریکہ کی منظم زندگی کی برکتوں کا تجزیہ بھی جگہ جگہ کرتے ہیں اور ہر انسان یا ہر منظر کو ایک متجسس دانش ور کی نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جہاں تک مصنف کے خالص نجی اور ذاتی مراسم اور خاندانی منظرنامے کا سوال ہے تو اس سلسلے میں ایسے بیش تر اساتذہ اور مصنف کے اعزہ و اقارب کا ذکر آیا ہے جن سے علی گڑھ مقامی طور پر خاصی واقفیت رکھتا ہے۔ ایسے تذکروں میں مصنف کی پسند و ناپسند اور بنتے اور بگڑتے ہوئے مراسم کی ایک تاریخ بھی مرتب ہو گئی ہے، لیکن اس نوع کے بیانات اس اعتبار سے اہمیت کے حامل بن جاتے ہیں کہ ان کے آئینے میں بہت سے ممتاز اور نیک نام لوگوں کے چہرے دیکھے جا سکتے ہیں اور بہت سے بیانات کے آئینے میں خود مصنف بھی اپنے مزاج اور افتادِ طبع کے ساتھ پوری طرح رونما نظر آتا ہے۔ اطہر صدیقی کو اپنے اظہار پر جس قسم کی قدرت حاصل ہے اس کی بدولت وہ مشکل سے مشکل اور پیچیدہ سے پیچیدہ فکر، نقطۂ نظر اور صورتِ حال کو نہایت سلاست، سادگی بلکہ فصاحت کے ساتھ بیان کرنے پر قادر ہیں۔ کہیں ایسا نہیں لگتا کہ الفاظ انکا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں اور کسی پر یہ بھی محسوس نہیں ہوتا کہ ان کا مافی الضمیر لکنت سے دوچار ہے۔ ایک زرخیز ذہن اور زبان پر

ماہرانہ گرفت اس کتاب کے وہ دو بنیادی عناصر ہیں جو شروع سے اخیر تک یادوں اور خیالات کو مہمیز کرتے رہتے ہیں اور قاری مسلسل مصنف کے تخلیقی عمل میں ایک شریک کار کی حیثیت حاصل کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

اطہر صدیقی کا خاندان تقسیم ہند کے المیے سے شدید طور پر دوچار رہا جس کے نتیجے میں انھوں نے تقسیم کے نتیجے میں رونما ہونے والے احساس مہاجرت اور شخصیات کے دو ٹکڑوں میں بٹ جانے کا راست تجربہ کیا ہے۔ اس کے شواہد مصنف کے ان اسفار کی تفصیل میں ملتے ہیں جو انھوں نے اپنے والدین اور دوسرے اعزہ سے ملاقات کی غرض سے کیے۔ ان تفصیلات میں خانگی زندگی کے کرب کے ساتھ جسمانی اور مادی ہجرت کے متوازی ذہنی، جذباتی اور روحانی ہجرت کے تجربے کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر مصنف کا عام بیانیہ بھی فکشن کے بیانیہ کی سطح پر پہنچ جاتا ہے، اور حقیقی کردار میں فکشن کے غیر متعین کرداروں کی طرح ہمہ جہت بن جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان کے وجود کا جواز یا عدم جواز، وہاں کی تہذیبی صورت حال اور سیاسی شعور کا ارتقاء جیسے مسائل بھی زیر بحث آتے ہیں۔ ان موقعوں پر مصنف جذبات سے بلند ہوکر سوچتا ہوا نظر آتا ہے اور سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے سلسلے میں اس کا نقطۂ نظر خالص معروضی ہوجاتا ہے۔

اطہر صدیقی کی ذاتی زندگی، خاندانی معاملات اور شعبہ جاتی منظر نامے میں ان کے برادر نسبتی پروفیسر عثمان ادھمی کو لاکھ متنازعہ فیہ سہی مگر بڑی اہمیت حاصل ہے۔ دونوں کے مابین مخاصمت اور غلط فہمیوں کی دیوار نے عرصے تک متعلقین کو شش و پنج اور آزمائش میں مبتلا رکھا تھا۔ اتفاق سے اطہر صدیقی نے ان غلط فہمیوں کا ذکر خود احتسابی کے انداز میں اپنی آپ بیتی میں متعدد مقامات پر کیا ہے۔ ایک قاری کو ان تنازعات سے تو غرض نہیں ہوسکتی مگر اس بات سے دلچسپی ضرور پیدا ہوتی ہے کہ اطہر صدیقی بار بار پرانے رویوں پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ان کو انسان کی مختصر سی زندگی میں بقائے باہمی کی پالیسی اور خوشگوار ماحول کو بنائے رکھنے کا رویہ زیادہ پسند ہے۔ اسی باعث جب وہ انسانی مراسم کے سلسلے میں اس نوع کے جملے لکھتے ہیں تو ان کی بہت سی انتہا پسندیوں کو نظر انداز کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے الفاظ ہیں کہ ”میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ اتنی چھوٹی سی زندگی میں آپس میں مل جل کر رہنا زیادہ بہتر ہے۔ مشغول زندگی میں محبت کرنے کا وقت ہی نہیں مل پاتا، نفرت کے لیے کہاں سے وقت نکالا جائے۔ میرے نزدیک انسان کسی سے اچھی طرح تعلقات نہ رکھ کر یا برا دل کر کے کبھی خوش نہیں رہ سکتا، اور خود ایک طرف کی ذہنی تکلیف میں مبتلا رہتا ہے“ بھلا ان خیالات کے حامل کسی شخص کے بارے میں یہ رائے کیوں کر قایم کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے تعصبات کو پال سکتا ہے اور نفرت کے جذبے سے وابستگی کو پسند کرسکتا ہے۔ تاہم مسلم یونیورسٹی کے بعض عمائدین بالخصوص وائس چانسلرز کے بارے میں ان کے یہاں قدرے شدت ملتی ہے۔ سید حامد کے گذشتہ بیس پچیس سال جس طرح رفاہی اور ملی کاموں میں صرف ہوئے ہیں اور جس انہماک اور قلبی لگاؤ کے ساتھ انھوں نے اجتماعی مسائل پر غور کیا اور لکھا ہے، اطہر صدیقی ان تمام رویوں کے باوجود ان کے بعض تسامحات کو نظر انداز کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے، یا پھر اپنے عظیم محسن پروفیسر انصار حسین کے سلسلے میں بعض غلط فہمیوں کے درآنے پر وہ بحیثیت خود اس کے ازالے کی سبیل نکالنے کی طرف توجہ نہ دے سکے، جب کہ اطہر صدیقی جیسی صد جہت فکر رکھنے والے اور اپنے رویوں پر نظر ثانی کرنے والے کسی حساس انسان کے لئے ان انتہا پسندیوں سے اغماض برتنا خاصا غیر متوقع معلوم ہوتا ہے۔

میں کیا میری حیات کیا؟، کی زبان، اسلوب بیان اور دلچسپی قائم رکھنے کے ہمہ جہت عناصر، اس آپ بیتی کو اردو کی اہم اور نمائندہ آپ بیتیوں میں ممتاز اور منفرد حیثیت کا حامل بنا دیتے ہیں۔ مصنف کا حسن مزاج اور اپنے اظہار پر مصنف کی غیر معمولی قدرت اس پر مستزاد ہے۔ اطہر صدیقی نے ایک سائنس داں ہونے اور سائنس کی تحقیق و تدقیق میں ہمہ تن مصروف رہنے کے باوجود اردو اور انگریزی ادبیات سے کبھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا، اس لئے ایک ایسی کتاب میں، جس میں ان کی شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کو بہ درجۂ اتم سامنے آنے کا موقع ملا ہے، اس میں وہ تخصص کے شعبوں سے وابستہ عام علما کی طرح کسری یا نامکمل آدمی ہونے کا کہیں تاثر نہیں دیتے اور ایسا لگتا ہے کہ ذہن نشو و نما کے مختلف ادوار میں انھوں نے اپنی طبیعت کے کسی رجحان کے ساتھ ناانصافی کا رویہ نہیں رکھا۔ زیر نظر آپ بیتی میں اپنی بیگم اور بچوں کے ساتھ ان کا نہایت متوازن اور فکری رویہ تو ملتا ہی ہے، انھوں نے اپنے طویل العہد ملازم تک کی شخصیت کو کسی مرحلے پر نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا ہے۔ یہ باتیں مصنف کی اخلاقی اور انسانی قدر و قیمت میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔

Deptt. of Urdu, A.M.U., Aligarh, (U.P.)

□□□

صفدر امام قادری

غضنفر سے گفتگو

معروف افسانہ نگار اور ناول نویس غضنفر مرکزی حکومت کے اہم لسانی ادارے "اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر"، لکھنؤ کے پرنسپل ہیں۔ ان کی پیدائش بہار کے گوپال گنج ضلعے میں 1953 میں ہوئی۔ اب تک ان کے سات ناول "پانی"، "کینچلی"، "کہانی انکل"، "مم"، "دویہ بانی"، "فسوں" اور "وش منتھن" شائع ہوچکے ہیں۔ پچاس سے زیادہ افسانے اور سیکڑوں نظموں اور غزلوں کے علاوہ انھوں نے "مشرقی معیارِ نقد" اور "زبان و ادب کے تدریسی پہلو" جیسی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جناب غضنفر سے صفدر امام قادری کی گفتگو قارئینِ "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: اردو کو عام لوگوں کے درمیان پہنچانے اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ آپ ایک تخلیقی فن کار ہونے کے ساتھ ساتھ اردو تعلیم و تدریس سے بھی براہِ راست جڑے ہوئے ہیں، اپنے تجربات کی بنیاد پر بتائیے کہ تدریسی عمل کو بہتر بنانے کے لیے کیا اقدامات کیے جانے چاہئیں؟

جواب: نئے تناظر اور تقاضوں کے تحت نصاب کی جدید کاری اور اس میں ضروری ترمیم آج سب سے پہلا کام ہے۔ پرانا نصاب ہماری ضرورتوں کا دینے سے قاصر ہے۔ اس میں نئے رجحانات اور تازہ تبدیلیوں کی نمائندگی نہیں ہورہی ہے۔ معاصر ادب کا تناسب موجودہ نصاب میں کافی کم ہے جب کہ اس کا حصہ زیادہ ہونا چاہیے۔ ہماری کتابوں میں قدیم سے جدید ادبی نمونوں کا سلسلہ پڑھایا جاتا ہے جب کہ اس کی ترتیب کو بالکل الٹ دینے کی ضرورت ہے۔ پڑھنے والا چوں کہ آج کی زبان سے واقف ہے، اس لیے اُسے آج کی زبان پڑھانے کے بعد مرحلے وار پیچھے کی طرف لے چلنا چاہیے۔ اس سے پڑھنے والوں کو زیادہ آسانی ہوگی۔

سوال: اردو کو مقبول بنانے کے لیے اور کیا کیا جاسکتا ہے؟

جواب: اردو میں معیاری قاعدے (پرائمر) نہیں ہیں۔ اردو حروفِ تہجی کی تعداد اور معیار بندی کے بارے میں بھی بعض غلط فہمیاں ہیں جنھیں اب تک دور نہیں کیا جاسکا اور انھیں ہمارے پرائمر ڈھو رہے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے اردو کے اہم ماہرینِ تعلیم اور دانشوروں کو مل کر ایک معیاری قاعدہ تیار کرنا چاہیے جس کی طباعت اور پیش کش بھی قومی معیار کی ہو۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ کشمیر سے کنیا کماری تک اس پرائمر کے استعمال کی صورت پیدا ہو۔ اگر ہم نے سائنسی نقطۂ نظر سے تیار کیے گئے اس پرائمر کو مقبول بنالیا تو ہمارے پاس اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد کئی گنا زیادہ ہوجائے گی۔ اسی کے ساتھ بچوں کے لیے کامکس اور ادبِ اطفال سے متعلق دوسری کتابوں کی زیادہ سے زیادہ اور دیدہ زیب طباعت عمل میں آئے تو اردو کے تئیں نوخواندہ افراد کو منعطف کرنے کا ایک بڑا ہتھیار ہمارے ہاتھ آجائے گا۔

سوال: اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے کس طرح کے تجربات کی ضرورت ہے؟

جواب: آج پروفیشنلزم کا دور ہے۔ اس لیے اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلے بغیر کسی زبان کی ترقی نہیں ہوسکتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو سے جوڑ کر زیادہ سے زیادہ پروفیشنل کورسیز شروع کیے جائیں۔ میڈیا کا زمانہ ہے۔ اس کی ترقی نے اردو کو سرگرم منچ فراہم کردیا ہے۔ اردو کا اسکوپ بڑھ گیا ہے۔ پرنٹ میڈیا کے ساتھ ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں بھی اردو جاننے والوں کو زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہورہے ہیں۔ اینکرنگ کرنے والوں میں جنھیں اردو کی جانکاری ہے، انھیں دوسروں کے مقابلے اہمیت اور اوّلیت مل رہی ہے۔ صحافت سے الگ، ترجمہ کاری، اسکرپٹ رائٹنگ اور فلم کے متعدد ایسے شعبے ہیں جن میں اردو جاننے والوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

سوال: کیا مقابلہ جاتی امتحانات میں بھی اردو زبان و ادب کے طالب علموں کے لیے بہتر مواقع ہیں؟

جواب: بہت سارے مواقع ہیں۔ میں ذاتی طور پر ایسے ایک درجن سے زیادہ لوگوں کو جانتا ہوں جنھیں صرف اردو کی بدولت ملک کی سب سے معزز نوکریاں حاصل ہوئی ہیں۔ آئی اے ایس، آئی پی ایس یا متعلقہ عہدوں کی دعویداری اردو زبان و ادب کی تعلیم حاصل کرکے بجا طور پر کی جاسکتی ہے۔ اسی کے ساتھ صوبائی مقابلہ جاتی امتحانات میں بھی اردو کے طالب علم کیوں کر کامیاب نہیں ہوسکتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سول سروسیز اور صوبائی امتحانات کی تیاری کے لیے کالج اور یونیورسٹی سطح پر اردو داں طالب علموں کے لیے خصوصی کوچنگ کا انتظام کیا جائے۔ اقلیتی حلقے میں کام کرنے والی تنظیموں کو آگے بڑھ کر ایسے حوصلہ مند اور باصلاحیت طلبہ کی تربیت کا معقول انتظام ہر شہر میں کرنا چاہیے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ سول سروسیز امتحانات کے لیے معیاری نصابی مواد بھی اردو میں تیار ہو جن سے فائدہ اٹھا کر ہمارے طلبہ کامیاب ہوسکیں۔

سوال: اردو کے مسائل کے حل میں کوئی نفسیاتی رکاوٹ تو نہیں؟

جواب: سب سے پہلے اردو والوں کو اپنے دماغ سے یہ بات نکال دینی چاہیے کہ اردو زبان پڑھنے لکھنے والوں کو نوکری نہیں مل سکتی۔ ہمیں اس نفسیاتی دائرے سے باہر نکلنا ہوگا۔ یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ جب ہم معیار کا خیال رکھیں گے اور ہماری لیاقت کی شناخت ہوجائے گی تو حکومت یا کوئی بھی ادارہ زیادہ دنوں تک ہمیں درکنار نہیں کرسکتے۔ ہر ادارے کو کوالٹی چاہیے، ایسے میں وہ ہماری صلاحیت کے استعمال کے لیے مجبور ہوں گے۔ اس لیے وہ آپ تک آئیں گے اور اردو آپ کے فروغ کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

سوال: آج کے ادب کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ہندی اور اردو دونوں میں آج بھی اسی قدر مستعدی، ایمانداری، خلوص اور خونِ جگر کے ساتھ ادب کی تخلیق ہو رہی ہے، جیسا ماضی کے شعرا و ادبا کرتے رہے ہیں۔ آج زبان و بیان، ہیئت اور تکنیک کے نئے نئے تجربے بھی ہو رہے ہیں۔ آج کی زندگی اپنی پوری آب و تاب اور تمام تر باریکی، خوبصورتی اور بدصورتی کے ساتھ ادب میں پیش ہو رہی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ آج ادب کم پڑھا جا رہا ہے۔ آج جو تخلیقات سامنے آرہی ہیں، ان کی قدر شناسی کا کام نہیں ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے نئے لکھنے والوں کی ادبی حیثیت کا تعین بھی نہیں ہو پا رہا ہے۔ ادب سے اس بے اعتنائی اور لاپروائی میں الیکٹرانک میڈیا اور صارفیت کا بھی بڑا ہاتھ ہے جس کا مقابلہ ادیبوں کے ساتھ ساتھ پورے سماج کو بھی کرنا ہے۔

سوال: آپ کی نظر میں ادب کی اہمیت کیا ہے؟ اچھی تخلیق میں کون کون سی چیزیں ہونی چاہئیں؟

جواب: ادب تفریح کا نام نہیں ہے۔ قدروں کی پامالی کے اس دور میں اگر حقیقی معنوں میں کوئی مرکزِ نگاہ یا روشنی کی کرن ہے تو وہ ادب ہی ہے۔ لیکن لفظ کی جادوگری کے بغیر کوئی آرٹ موثر نہیں بن سکتا۔ تخلیق کار اپنے خوابوں میں ایک بہترین دنیا بساتا ہے مگر بڑا ادب اس وقت سامنے آئے گا جب آپ کے لفظ تصویر بن جائیں، لفظ سُر بن جائیں، رنگ، پھول اور خوشبو میں بدل جائیں یہ بے جان سے لفظ۔ تب پیدا ہوگا سچا اور بڑا ادب۔ تب سامنے آئے گی کوئی لافانی تخلیق۔

سوال: اردو اور ہندی کو قریب لانے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟

جواب: جن زبانوں میں قواعدی یکسانیت ہوتی ہے انھیں الگ الگ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اردو اور ہندی تو ایک ہی ماحول میں پیدا ہوئی زبانیں ہیں، ان کا اشتراک باہم تاریخ اور موجودہ عہد کے تقاضوں کا فطری نتیجہ ہے۔ دونوں زبانوں کے مشترکہ فیچرز (Features) کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ ان زبانوں میں ہندستانیت کی جو خوشبو ہے اسے اجاگر کرنے کی ضرورت ہے۔ دونوں زبانوں کی مشترکہ اصناف پر تفصیل سے گفتگو ہونی چاہیے۔ ایسے کئی ادبی ادارے اور تنظیمیں ہیں جہاں اردو اور ہندی کے لکھنے والے جمع ہوجاتے ہیں۔ 1936 میں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کے قیام کے ساتھ کثیر لسانی ادبی منچ کا تصور واضح شکل لے سکا۔ یہ اشتراک ابھی تک چل رہا ہے۔ اس کے باوجود سچائی یہی ہے کہ ایسے منچ اور زیادہ نہیں بنائے جاسکے جہاں اردو اور ہندی کے لکھنے والے ایک ساتھ بیٹھنے میں کوئی پریشانی نہ محسوس کریں۔ آج جو اشتراک ہے، وہ چند منتخب اہلِ قلم کی لبرل اور خیرسگالی کے جذبات کی وجہ سے ہے۔ آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ اردو اور ہندی کے مشترکہ منچ کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا جائے۔ تبھی ہم اپنے لسانی تنازعات کو بھی سلجھا سکتے ہیں اور سماجی جمود اور بنیاد پرستی سے بھی مقابلہ کرسکتے ہیں۔ اگر ہم نے ایسے صحت مند ماحول بنانے میں کامیابی پائی تو شاید اس ملک میں پہلی بار ادیبوں اور شاعروں کی آواز کی طاقت محسوس کی جاسکے لیکن اس کے لیے ہمیں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدوں کو توڑنا ہوگا۔

سوال: اردو اور ہندی زبانوں میں لین دین کی موجودہ صورتِ حال کو آپ کس طور پر دیکھتے ہیں؟

جواب: دونوں زبانوں میں ایک دوسرے کی تخلیقات کا کثرت سے ترجمہ ہونا چاہیے۔ موجودہ صورتِ حال میں اس میں مزید تیزی لانے کی ضرورت ہے۔ ایک زبان میں دوسری زبان سے متعلق جن خصوصی اشاعتوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے، اسے اور مضبوط ہونا چاہیے۔ جس طرح ہندی میں اردو ادب پر مرکوز کئی رسائل کی اشاعت کا ماحول بنا ہے، اسی طرح ہندی ادب پر اردو میں کسی نئے رسالے کا تصور ناممکن نہیں۔ ہاں، نمائندہ ادب کو اولیت ملنی چاہیے ورنہ کچھ لوگ ہندی میں اردو کے عظیم اہلِ قلم معلوم ہوں گے جبکہ سچائی یہ ہے کہ انھیں اپنی اصل زبان میں ایک معمولی مقام میسر ہے۔ ترجمے کے سلسلے میں بھی ایک معیارسازی کی ضرورت ہے۔ اس میں ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ آج تک اردو اور ہندی زبانوں کو بنیاد بنا کر کوئی بڑی ڈکشنری تیار نہیں کی جاسکی۔ بازار میں جو پانچ دس لغات موجود ہیں ان میں اکثر غلط اور غیر معیاری ہیں۔ میرے ادارے ''اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر' لکھنؤ نے اردو ہندی اور ہندی اردو لغات تیار کرنے کا کام شروع کیا ہے۔ ملک بھر سے ماہرین کی مدد لی جارہی ہے۔ قومی اردو کونسل بھی اس جانب توجہ دے رہی ہے۔ آنے والے دنوں میں شاید یہ کمی دور ہوجائے۔

سوال: آپ کن ادیبوں سے متاثر ہوئے؟

جواب: فطرت کا قانون ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ جن لوگوں کی تخلیقات کو میں نے پڑھا، ان سے محسوس یا غیر محسوس طریقے سے متاثر ہونا فطری ہے۔ بزرگ اور عظیم لکھنے والوں نے بلاشبہ میرے لکھنے کی صلاحیت کو جلا دی۔ اردو میں مرزا محمد ہادی رسوا، پریم چند، منٹو، بیدی، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، اقبال مجید، ہندی میں پھنیشور ناتھ رینو، منوہن راکیش، شری لال شکل، منو بھنڈاری، راجندر یادو، اوشا پریمودا، غیر ملکی لکھنے والوں میں کافکا، گورکی، دوستوئفسکی، ترگنیف، جیسے ادیبوں کو میں اپنی تخلیقی زندگی کے لیے رہنما تصور کرتا ہوں۔

سوال: پچھلے دس بارہ برسوں میں یہ یہ آپ کے سات ناول شائع ہوئے۔ اس برق رفتاری کے پیچھے کیا کوئی ذاتی حکمتِ عملی بھی پوشیدہ ہے؟

جواب: میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر ناول میں ایک نئی اور تجرباتی زمین کی تلاش کروں۔ ناول لکھتے وقت مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ یہ لفظ "ناویلا" سے نکلا ہے جس کا مطلب "نیا" ہوتا ہے۔ مجھے قصہ گوئی کی وہ روایت کبھی پسند نہیں آئی جس میں ساری باتیں کھلے طور پر سامنے کہہ دی جاتی ہیں۔ مجھے راست بیانیہ پسند نہیں ہے۔ اس لیے میں نے اپنی تخلیقات کو تہہ در تہہ بُننے کی کوشش کی۔ تخلیق میں کچھ ایسا چاہیے جو چھپا ہوا ہو۔ معنوی گہرائی کے بغیر تخلیق کی دیرپا اہمیت نہیں ہوتی۔ عظیم ادیبوں کی تخلیقات کو جب بھی ہم پڑھتے ہیں، ان کی معنویت نئے سرے سے سمجھ میں آنے لگتی ہے۔ وقت بدلنے کے ساتھ اگر کسی تخلیق کو زندگی مِلتی ہے تو اس کے پیچھے ویسی معنوی تہہ داری اور گہرائی ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے دانستہ طور پر اپنے ادب کے ماحول کو تھوڑا پیچیدہ، غیر روایتی اور تجربہ پسند بنانے کی کوشش کی ہے۔

سوال: ایسا کوئی موضوع ہے جسے بار بار آپ اپنی تخلیقات میں پیش کرنا چاہتے ہیں؟

جواب: سچ کہوں تو میں انسانی جبر کی کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔ انسانی سماج نے تاریخ کی اندھی سرنگوں کو پار کرتے ہوئے جس طرح سے اپنا وجود لہولہان کیا ہے، اُس دُکھ اور سوز کو میں اپنی تخلیقات میں واضح کر پایا اور اس جبر کو زیر کرنے کا فنکارانہ رویّہ ابھار پایا تو میں خود کو خوش نصیب سمجھوں گا۔ "پانی"، "کہانی انکل"، "دوِیہ بانی" اور "وِش منتھن" تمام ناولوں میں مَیں نے اسی جبر کے خلاف ایک انسانی طاقت کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔

سوال: اپنے تازہ ناول "وِش مَنتھن" کے ذریعے آپ نے کن موضوعات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے؟؟

جواب: "وِش منتھن" میں تاریخ کے تناظر میں ہندو اور مسلمان دونوں جماعتوں کے اصل مسائل کیا ہیں اور ان کے اختلافات کی بنیادیں کیا ہیں، انھیں تاریخی تسلسل میں پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک تخلیق کار کے طور پر میں نے معروضی تجزیہ نگار کی نازک ذمے داری ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

سوال: آپ کی زبان کے بارے میں اردو کے ناقدین کچھ تذبذب کا شکار ہورہے ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ ناولوں کی ایک علاحدہ اور ذاتی زبان خلق کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو یہ نئی زبان کیا ہے اور آخر اسے بنانے کی ضرورت کیوں پڑی؟

جواب: اسلوب کے لیے ایک سچائی تو یہ ہے کہ موضوع کا جیسا تقاضا ہوتا ہے ویسی ہی زبان تیار کی جائے۔ کہتے ہیں، ہر موضوع اپنی ایک الگ زبان لے کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ میں خاص طور سے زبان کے معاملے میں اپنے دوسرے دوستوں کے مقابلے زیادہ مستعد رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے ایک ناول سے دوسرے ناول تک پہنچتے پہنچتے میرا قاری ایک نئی اسلوبیاتی زمین پر آکھڑا ہوتا ہے۔

سوال: کیا اس اسلوبیاتی تجربہ پسندی کو آپ اپنے ناولوں کی داخلی دنیا کے حوالے سے واضح کرنا چاہیں گے؟

جواب:۔ میں نے اپنے پہلے ناول "پانی" میں ازل سے اَبد تک کی انسانی پیاس کی کہانی لکھی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے میں نے داستانی اور تمثیلی رنگ کو آزمایا ہے لیکن جیسے ہی موجودہ زمانے کا حوالہ آتا ہے، ایک نئی زبان آپ کے سامنے کھڑی ہوجاتی ہے۔ حضرت خضر اور شیوساگر کے واقعات لکھتے ہوئے میں نے مختلف اسلوبیاتی جزیرے خلق کرنے کی کوشش کی ہے۔ "کہانی انکل" میں چونکہ بچوں کو کردار بنایا گیا ہے، اس لیے ان کی مناسبت سے ایک نئی زبان استعمال کی گئی ہے۔ "دوِیہ بانی" میں ویدک عہد سے موضوع کا رشتہ ہے اس لیے اس میں سنسکرت کے اثرات والی ہندی دکھائی دے گی۔ ہر تخلیق میں میری یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسلوب کے ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کا بھی ایک نیا طبقہ پیدا ہو۔ ان دونوں باتوں کو مرکز میں رکھ کر ہی میں اپنی تخلیقات پیش کرتا ہوں۔ پڑھنے والے میری تخلیقات کو قبول کریں، یہی میرا مقصد ہے۔

سوال: قومی اردو کونسل نے اردو داں طبقے کو انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑنے کی جو کوششیں کی ہیں ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: قومی اردو کونسل نے اردو داں طبقے کو انفارمیشن ٹیکنالوجی سے جوڑنے کا جو کام شروع کیا، وہ لائقِ صد ستائش ہے۔ اس سے جہاں ایک طرف اردو والوں کو روزگار کے نئے مواقع فراہم ہورہے ہیں وہیں اردو زبان کا دامن نئے نئے الفاظ اور نئی نئی اصطلاحات سے وسیع ہو رہا ہے اور یہ زبان نئے علوم کے اظہار کا موثر ذریعہ بن رہی ہے۔

سوال: اردو کو روزگار سے جوڑنے کے لیے مزید کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں؟

جواب: اردو کو روزگار سے جوڑنے کے جو نئے اقدامات کیے جاسکتے ہیں، ان میں صحافتی کورس، میڈیا والوں کے لیے اسکرپٹ رائٹنگ کورس، سول سروسیز اور ریاستی مقابلہ جاتی امتحانات میں شامل ہونے والے امیدواروں کے لیے اچھے کوچنگ سینٹرز وغیرہ کا قیام موثر ثابت ہوسکتے ہیں۔ مترجمین کے لیے ترجمہ نگاری کا ڈپلوما کورس شروع کیا جاسکتا ہے۔

سوال: قارئین "اردو دنیا" کے لیے آپ کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جواب: "اردو دنیا" کے قارئین سے میں یہی گزارش کروں گا کہ اردو زبان سے آپ جذباتی رشتہ قائم کیجیے، اس رشتے کو اپنے بچوں میں بیدار کیجیے، اور اپنے بچوں کو یہ احساس دلایئے کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جسے جاننے سے شخصیت نکھرتی ہے، قوتِ اظہار میں بہتری آتی ہے اور انسان کے ذہن و دل روشن ہوتے ہیں۔ انھیں یہ بات باور کرادیجیے کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کو سنیں، آپ کے قریب آئیں، آپ کی باتوں کو ذہن و دل میں بسائیں تو اردو پڑھیے، اردو بولیے اور اردو لکھیے۔

□□□

خواجہ غلام السیدین

ہماری مطبوعات

(''تعلیمی تشکیلِ نو کے مسائل'' سے اقتباس)

گاؤں میں تعلیم کا رول

ہم اس موقعے پر ابتدا ایک فرسودہ قول سے کرتے ہیں۔ اکثر فرسودہ اقوال میں صداقت کا مغز موجود ہوتا ہے اور اگر ہم انھیں یکسر فرسودہ سمجھ کر ٹال نہ جائیں تو یہ خاصے مفید بھی ہو سکتے ہیں۔ ہندستان اصلاً دیہاتوں کی سرزمین ہے۔ غیر منقسم ہندستان میں سات لاکھ گاؤں تھے اور اگر ہم مجموعی طور پر ملک کی بھلائی کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو آغاز کار کے لیے موزوں جگہ اور مرکزِ توجہ گاؤں ہی کو ہونا چاہیے۔ موجودہ صدی کی ابتدائی دہائیوں میں اکثر تعلیمی اور سماجی تحریکیں شہروں اور شہری علاقوں ہی میں اُبھریں اور جہاں تک حکومت یا کارکنانِ قوم کا تعلق ہے، گاؤں کے وجود کا انھیں محض سطحی شعور تھا لہٰذا دیہات کی بہتری کے لیے کچھ زیادہ نہیں کیا جاسکا۔ یہ صورتِ حال کچھ تو اس بنا پر تھی کہ ہندستانی طرزِ زندگی میں گاؤں کی اہمیت کا پورا پورا احساس نہ تھا اور کچھ اس بنا پر کہ مسئلہ اتنا زبردست تھا کہ لوگ سمجھتے تھے اس معاملے میں کچھ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ مشکل اور ناگوار فرائض سے بچنے کے لیے انسان کی ذہانت نہایت خوشنما بہانے تراش سکتی ہے۔ لیکن کچھ مستثنیات بھی تھے، متفرق افراد اور کچھ مختصر گروہ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنے آپ کو پورے اخلاص کے ساتھ گاؤں کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا تھا اور حکومت کی طرف سے کبھی کبھی گاؤں کی تعمیر و ترقی کے کام میں ہماہمی نظر آجاتی تھی۔ لیکن ان کی حقیقت اس سے زیادہ نہ تھی کہ گویا یہ تاریک افق میں کہیں کہیں جھلملاتی ہوئی کمزور روشنی کے نقطے ہوں۔ یہ دعوا بالکل بجا ہوگا کہ جب تک گاندھی جی نے منظرِ عام پر آکر تقریباً سبھی سماجی، سیاسی اور اقتصادی قدروں اور اصولوں کو یکسر الٹ کر نہ رکھ دیا، اس وقت تک گاؤں اپنے صحیح مقام کو نہ پاسکا تھا، اور نہ ہی ہمارے سیاستدانوں کی توجہات کا مرکز بن سکا تھا۔ گاندھی جی ہی کی ذات تھی جس نے خیال و مثال کے ذریعے ہندستانی رہنماؤں کو یہ بنیادی حقیقت سمجھائی کہ انھیں رُخ گاؤں کی طرف پھیر دینا چاہیے اور تعمیرِ نو کی ابتدا اسی نقطے سے کرنا چاہیے، اگر وہ فی الواقع ملک کی صورتِ حال کو بنیادی طور پر بدل دینے کے خواہشمند ہیں۔ یہ انھی کی حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا کہ ہزاروں رضاکاروں نے دیہی آبادی میں اپنے آپ کو گم کردیا۔ کام ان کا نہایت صبر آزما تھا اور بہت کم ایسا ہوا کہ وہ منظرِ عام پر آسکا ہو، لیکن بتدریج سیاسی بیداری اسی کی بدولت پیدا ہوئی، جو بالآخر حصولِ آزادی کی مہم سر کر کے رہی۔

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ابتدائی تعلیم کو بہتر بنانے کی کوششیں کہیں کہیں جاری تھیں، لیکن واضح رہنمائی اس میدان میں بھی گاندھی جی ہی سے ملی۔ جب کہ انھوں نے 1937 میں اپنے بنیادی اصول کی اسکیم کو عملی صورت بخشی۔ زندگی بھر کے تجربات نے انھیں یقین دلا دیا تھا کہ کسی سماجی، سیاسی اور اقتصادی تبدیلی کا رونما ہونا ممکن نہیں، جب تک کہ تعلیمی نظام میں بنیادی تبدیلی نہ پیدا کردی جائے اور یہ تبدیلی محض طریقِ تدریس یا نصابِ تعلیم ہی میں نہ ہو بلکہ تعلیم کے فکری نظام اور اس کے مقاصد تک کو متاثر کرے۔ اس طرح انھوں نے ملک اور ماہرینِ تعلیم کے سامنے اپنی بنیادی تعلیم کی اسکیم رکھی، جس کا مرکزی تصور یہ ہے کہ تعلیم کا مطمحِ نظر کتابیں نہیں بلکہ گاؤں کے وہ پیشے اور مشاغل ہونے چاہئیں، جو دیہی زندگی کی روحِ رواں ہیں۔ موجودہ نظام جو لکھنے پڑھنے اور حساب کی جامد تدریس تک محدود ہے، نہ صرف خود زندگی سے بے تعلق ہے، بلکہ اسکول کے بچوں کو بھی زندگی کے حرکت آفریں اور بامعنی مشاغل سے کاٹ کر الگ کردیتا ہے، دیہات کا کوئی اسکول اگر بچوں کو خود دیہی زندگی سے اجنبی بنا دیتا ہے، تو پھر ایسے اسکول کو دیہات کے لوگ اپنے دل و دماغ میں کیسے جگہ دے سکتے ہیں؟ اور یہ بچے دیہاتی زندگی میں کس طرح کسی قابلِ قدر یا تخلیقی کارنامے کا اضافہ کرسکتے ہیں؟ فطری طور پر ان بچوں کا ماحول یہی ہوگا کہ گاؤں سے تو کٹ کر الگ ہو جائیں اور قریبی شہروں میں اپنے لیے کوئی راستہ نکالیں۔ اس طرح حوصلہ مند اور باصلاحیت بچے گاؤں سے دور تر ہوجاتے ہیں اور گاؤں کا مستقبل مفلس سے مفلس تر ہوتا جاتا ہے۔ دیہی تعلیم کی ذمّے داری ایک ایسی فکری بنیاد فراہم کرنا اور اسے عملی شکل دینا اور ایسی تدابیر اختیار کرنا ہے جو بچوں کے اندر گاؤں میں مستقل قیام کی خواہش کو مستحکم کرے اور ان کو اس طرح تربیت دے کہ وہ ان بستیوں کی خدمت اور خوشحالی اور ترقی کے کاموں میں لگ جائیں۔ صرف یہی چیز ہے جو تعلیم کو حقیقت سے ہمکنار کرسکتی ہے اور بچوں کی دلچسپی کو بروئے کار لاسکتی ہے

● اسکول میں ایک ایسا ماحول بنانا جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں آزاد فضا میں نشوونما پاکر ابھر سکیں، ان کی فطری نشوونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جائے۔ اس کتاب میں خواجہ غلام السیّدین نے انھی امور پر گفتگو کی ہے۔ کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ ایم ابوبکر نے کیا ہے۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 307 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 96روپیے ہے۔ طالب علموں اور اساتذہ کو کونسل کی کتابوں پر 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔

وہی دلچسپی جسے کتابی نصابِ تعلیم اور غیر نفسیاتی طریقِ تعلیم نے یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

گاؤں کی تشکیلِ جدید میں تعلیم کے رول کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے: گاؤں کے وہ کون سے مخصوص مسائل ہیں جن سے دانش مندانہ اور بامقصد طور پر نمٹنے کے لیے بچوں کو تیار کرنا ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ گاؤں اصل میں ایک ایسی برادری ہے جہاں سب کام کرتے ہیں کہ جہاں صحت مند سماجی حالات میں سبھی کو کام کرنا ہے اور یہ کام کتابوں اور فائلوں کا کام نہیں ہے یہاں تو آدمی ہے، کچھ اشیا اور اوزار ہیں اور فطرت کا کھلا میدان ہے اور کام جو کچھ ہے سرتا سر عملی، پیداواری ہے جسمانی مشقت کا ہے۔ مثلاً زمین جوتنا، فصل اگانا، مویشیوں کی دیکھ بھال کرنا، اینٹیں تھاپنا، کپڑا بننا، جھونپڑیاں بنانا اور ان مختلف ضرورتوں میں ایک دوسرے کی عملاً مدد کرنا، جو گاؤں کی زندگی کو رواں دواں رکھتی ہے۔ اب اگر اس نقشے میں کسی بچے کو اپنے لیے جگہ بنانا ہے، تو کوئی بھی عملی کام اس کے سامنے آئے اُسے خوش دلی اور مہارت کے ساتھ انجام دینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مدرسے کی تعلیم کا مرکز، دستکاری اور عملی کام کو ہونا چاہیے یہی وہ تعلیمی طریقۂ کار ہے، جسے بنیادی تعلیم میں اختیار کیا گیا ہے علاوہ بریں گاؤں کے اور مسائل بھی ہیں مثلاً صفائی، آب رسانی، صحت اور حفظانِ صحت، مجبوری کی فرصت، نقصان رساں کام کے طریقے۔ یہ سب اسی وقت حل ہو سکتے ہیں، جب گاؤں کے رہنے والے لوگ ان کے بارے میں مناسب اور صحیح علم رکھتے ہوں اور انھیں اسی علم کو زندگی میں پیش آنے والے مختلف حالات میں استعمال کرنے کی تربیت بھی حاصل ہو۔ ہمیں یہ اشارہ ملتا ہے کہ ایک ایسا نصابِ تعلیم ترتیب دیا جائے اور خاص کر سماجی علوم اور جنرل سائنس میں، جو دیہی زندگی کے حقیقی مسائل سے پوری طرح مربوط ہو اور جسے اس طرح پیش کیا جائے کہ مدرسے کی تعلیم اور زندگی میں پیش آنے والے مسائل کے بیچ کی روایتی دیوار آپ سے آپ غائب ہو جائے۔

پھر اس کی بھی ضرورت ہوگی کہ اعلا سطح پر دیہی ادارے قائم کیے جائیں، جہاں نوجوان مردوں اور عورتوں کو گاؤں کی تشکیلِ جدید کے سلسلے کے سماجی اور تکنیکی مسائل کو ماہرانہ طور پر حل کرنے کی تربیت دی جائے۔ سوم یہ کہ بہت سے تعصبات، توہمات، اور غیر صحت مند اور شہریت کے اصول کے خلاف سماجی رسم و رواج ہیں جو ہمارے دیہاتوں میں روشن خیالی اور صحیح طرزِ زندگی کی راہیں روکتے ہیں۔ مدرسے کو اس لائق ہونا چاہیے کہ نہ صرف بچوں بلکہ ان کے والدین میں بھی اس طرح کے خیالات و اعمال کی نامعقولیت اور خطرات کا احساس پیدا کردے اور ظلمت پسندی اور غلط روایات کے خلاف برسرِ پیکار ہو۔

یہ سارا کام مطالبہ کرتا ہے کہ مدرسے کے تمام بچوں میں سماجی خدمت کا جذبہ ہونا چاہیے تاکہ وہ محض آپ ہی اچھی باتیں سیکھنے اور عمدہ طور طریقے اختیار کرنے پر اکتفا نہ کریں بلکہ اپنے حلقے کے سبھی لوگوں کو اپنے علم و عمل میں شریک کرنے کے لیے بے چین ہوں۔ مدرسے کو اس طرح ہمیں ایک ایسی زندگی اور ایک ایسے رواں دواں ماحول میں پروان چڑھانا ہے، جہاں بچوں کو نہ صرف ایک مستقبل بعید کے لیے سماجی خدمات کی تربیت دی جاتی ہے بلکہ اُن کی صلاحیت اور سکت کے مطابق مختلف قسم کی سماجی خدمات کے حقیقی مواقع فی الحال موجود ہوتے ہیں۔ کوئی یہ نہ سوچے کہ بچے آخر کر ہی کیا سکتے ہیں! جہاں دل کی لگن ہو اور معلمین میں تخیل اور عقلِ سلیم موجود ہو، وہاں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ میں نے ریاست ممبئی کے اسکولوں میں رضا کارانہ اصول پر کی جانے والی سماجی خدمات کا سروے کرایا تھا۔ مجھے یہ معلوم کرکے مسرّت بخش تعجب ہوا کہ ابتدائی اور ثانوی اسکولوں کے بچے اس نئے تعلیمی نصب العین کی پکار کا کس خوبی سے استقبال کر رہے ہیں اور وقت کے چیلنج کا کتنا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ زیادہ اناج اگاؤ کی مہم چلا رہے تھے، گاؤں کی صفائی کا انتظام کرتے تھے، سماجی تعلیم کے مراکز چلا رہے تھے، مقامی آبادیوں پر تفریحی مشاغل کا بندوبست کرتے تھے، اسپتالوں کا معائنہ کرتے تھے اور ان کے علاوہ مختلف مفید سماجی خدمات میں لگے ہوئے تھے۔ یقیناً سبھی اسکول ایسا نہیں کر رہے ہیں، کرنے والے تو مجموعی تعداد کا ایک حقیر سا حصہ ہیں۔ لیکن مستقبل کے حق میں وہ ایک شگون نیک ہیں اور وہ اس حقیقت کا پتہ دیتے ہیں کہ اگر سچی لگن اور صحیح علم ہو، تو دوسرے اسکول بھی کیا کچھ کر سکتے ہیں، اور یہ کام ہر منزل اور ہر مقام سے شروع کیا جا سکتا ہے، وہ بیج جو جڑ پکڑنے کے بعد قابلِ قدر سماجی خدمات کے برگ و بار لا سکتے ہیں وہ بچوں کے دماغوں میں پرائمری منزل سے بھی پہلے جمائے جا سکتے ہیں۔ ہم اپنے بیسک اسکول میں ننھے بچوں کو بھی اجتماعی ڈھنگ سے کام کرنے پر اکساتے ہیں۔ انھیں چھوٹے چھوٹے فرائض اور ذمے داریوں کو قبول کرنے کے لیے تیار کرتے ہیں مثلاً اپنے کمروں کو صاف ستھرا رکھنا اور جس قدر ممکن ہو اپنے اسکول کی دیکھ بھال کرتے رہنا وغیرہ۔ کچھ ہی مدّت کے بعد اسکول کے باہر کام کرنے اور دیہات کے لوگوں کے دوش بدوش ان کے مشاغل اور مصروفیتوں میں شریک ہونے، نیز صفائی اور صحت کے پروگرام چلانے کے لیے ان کے حوصلے بڑھائے جاتے ہیں۔ اگر یہی جذبہ ابتدائی تعلیم کے بعد بھی باقی رکھا جا سکے اور ثانوی اسکول اور کالج کے طلبہ اور اساتذہ میں بھی یہی لگن اور اسپرٹ ابھاری جا سکے تو ہم اپنی دیہی آبادیوں میں ایک خاموش مگر عظیم

انقلاب لاسکتے ہیں۔ یہ بڑی عمر کے طلبہ اپنی چھٹیوں اور بڑی تعطیلات کو گاؤں میں کام کرنے کے لیے وقف کرسکتے ہیں اور اس طرح وہ اپنی تکنیکی معلومات اور تہذیبی ورثے کی مدد سے گاؤں کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لیبر اینڈ سوشل سروس کیمپس اور طلبہ کے ذریعے چلائے جانے والے درسگاہی منصوبوں کی تحریک نے جس کی ابتدا اول پنج سالہ منصوبے کے دوران ہوئی تھی اور جسے برابر جاری رکھا گیا ہے، اسکولوں اور کالجوں میں اچھی خاصی دلچسپی اور جوش وخروش کی کیفیت پیدا کردی ہے۔ لیکن اس سلسلے کا بیشتر کام، گاؤں کے ہزاروں گمنام ابتدائی اور ثانوی اسکولوں ہی کو کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ کوئی بھی جماعت اپنے مستقبل کو اپنے ہی افراد کے ذریعے ذاتی سوجھ بوجھ سے کام لے کر اور اپنی مدد آپ کرکے ہی روشن بنا سکتی ہے۔ اگر شہروں کے تعلیم یافتہ نوجوان گاؤں میں جاتے ہیں، تو اس سے خود ان ہی کی روحوں کو بالیدگی نصیب ہوگی کہ وہ اس قرضے کا کسی حد تک بھگتان کرسکیں گے، جو دیہاتوں کا شہروں کے ذمے چلا آتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اور بہت سی باتیں سیکھ سکیں گے۔ مگر ہماری دیہی آبادی کی تعمیرِ نو اسی وقت ممکن ہوگی جب ان میں رہنے بسنے والے بچے خوداعتمادی کا سبق سیکھ لیں گے اور سماجی شعور و احساس سے معمور ہوکر ان تمام رکاوٹوں کو دور کردینے کا تہیہ کرلیں گے، جو ایک بہتر زندگی کی راہ ہموار کرنے میں مانع ہیں۔

اب یہ صاف عیاں ہے کہ یہ کام ہے ایک جاندار اور ازسرِنو منظم کیے گئے نظامِ تعلیم کا کہ جس کی جڑیں دیہی زندگی کی گہرائیوں میں جمی ہوئی ہوں اور جو ساتھ ساتھ ایسے نصب العین سے فیضان حاصل کرلے جسے آسمان کے ستاروں سے بھی آنکھیں ملانے میں باک نہ ہو۔

انڈین یونیورسٹیز کمیشن کی قابلِ قدر رپورٹ میں ایک نہایت قیمتی باب دیہی یونیورسٹیز پر بھی ہے اور اصل بحث کی تمہید کے طور پر اس میں بنیادی اور مابعد بنیادی تعلیم کے امکانات کا جائزہ گاؤں کی صورت حال کے پیش منظر میں لیا گیا ہے۔ میں یہاں اس کا ایک اقتباس پیش کروں گا کیونکہ یہ دیہی تعلیم کے باب میں میرے نقطۂ نظر کی مستند حمایت پیش کرتا ہے۔

''اپنی تاریخ کے اس فیصلہ کن مرحلے پر ہمارے سامنے فلسفۂ تعلیم اور ساتھ ساتھ ایک عملی نقشے کا پیش کیا جانا جو عالمگیر اساسی خوبیوں کا حامل ہے اور جس کے ذریعے سے ٹھیک ہماری آرزوؤں کے مطابق ایک جدید ہندستان کی تخلیق میں بھرپور مدد مل سکتی ہے ہم سب کے لیے انتہائی خوش قسمتی کا باعث ہے۔ گاندھی جی کے تصورِ تعلیم کو مجموعی طور پر اپناتے ہوئے ایک ایسے طریقۂ تعلیم کی تخم پاشی کرنا ہے جو انسانی شخصیت کی تکمیل اور پاکیزگی کا ضامن ہوگا اور جیسے جیسے وقت گزرے گا اس کی حکمت اور عمدگی نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جائے گی اور وہ وقت کی ہر آزمائش اور وقت کی کسوٹی پر کھرا اترے گا۔ تعلیم کے حق میں دنیا کے جو عظیم عطیات ہیں یہ تصور بنیادی طور پر ان میں سے ایک ہے۔''

اس طریقے کی مبادیات کا جو خاکہ گاندھی جی نے پیش کیا ہے وہ چھوٹے بچوں کی تعلیمی ضروریات کی تکمیل کا محض ایک ذریعہ ہی نہیں ہے، بلکہ انھوں نے تعلیم کے ایک عالمگیر طریقے کے ضروری عناصر کی وضاحت کی ہے، جس کا تعلق اس دور سے لے کر جب بچہ ماں کے کاموں میں شرکت کرنے کے قابل ہوجاتا ہے اس وقت تک ہے جب وہ اپنی شخصیت کی بتدریج تکمیل کے ساتھ اس دور میں داخل ہوتا ہے جب ایک پختہ کار انسان کی حیثیت سے اپنے مرتب و منضبط فکروکردار کی مدد سے ایک عظیم تخیل کو عملی صورت بخشنے کے لیے کسی ماہرفن کے پہلو بہ پہلو کام کرنے لگتا ہے۔

جب تعلیم کا یہ عظیم نقشہ عملاً بروئے کار آئے گا، اسی وقت یہ ممکن ہوگا کہ ہمارے تخیل کے بہتر دیہات وجود میں آئیں۔ □□□

ہندستان کا صنعتی ارتقا

مصنف: ڈاکٹر ڈی آر گیڈگل، پروفیسر ایم صدیقی

ہندستان کی تاریخ میں 1857 ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اس سال نہ صرف ملک پر پوری طرح سے انگریز قابض ہوگئے بلکہ اسی کے بعد ہندستانیوں کی خود احتسابی کا دور بھی شروع ہوا جس کے نتیجے میں مختلف اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں اور ملک نشاۃ الثانیہ سے ہم کنار ہوا۔ 1857 کے بعد سے ہی صحیح معنوں میں ہندستان کی صنعتی ترقی بھی شروع ہوئی۔ اس کتاب میں 1860 سے 1939 تک ملک کے صنعتی ارتقا کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 343، قیمت:-/130 روپے

صنعتی تنظیم اور انتظام

مصنف: محمد احترام اللہ

آج کے صارفی سماج میں انتظامی شعبے کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ ایک کامیاب منتظم حال پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ کتاب نہ صرف بی۔کام کے طالب علموں کی ضرورت کو پورا کرتی ہے بلکہ علم دوست اردو قاری کو بھی جدید صنعتی شعبے اور معیشت کے دیگر رموز سے آگاہ کرتی ہے۔

صفحات: 606، قیمت:-/149 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک-1، ونگ-6، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

مصنف: دیویندر اسّر
ہماری مطبوعات ("عوامی ذرائع ابلاغ، ترسیل اور تعمیر و ترقی" سے اقتباس)
مترجم: شاہد پرویز

ترسیل و ابلاغ اور سماجی تبدیلی

"ترقی کے لیے کئی چیزوں کی ایک ساتھ ضرورت ہوتی ہے۔ بڑے شہروں کے روزنامے "نیویارک ٹائمز" کی حیثیت پانے کے متمنی ہیں تو ہفتہ وار پرچے "اکنومسٹ" کے معیار تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ قومی ترقی کے لیے اعلا تعلیم یافتہ اور اعلا کردار کے حامل اخبار نویسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی بات ان اخبارات و رسائل پر بھی منطبق ہوتی ہے جو دیگر مقامی زبانوں میں کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے شائع ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح مقبولِ عام ریڈیو اور فلم کی ضرورت بھی مسلّم ہے۔"(1)

مذکورہ بالا اقتباس ایک طرح سے اس انقلابی دور کے معاشرے میں عوامی نشریات کے مسائل کا اجمالی خاکہ ہے۔ ایک ترقی پذیر مملکت کو متعدد چیزوں کی بہ یک وقت ضرورت ہوتی ہے جو فی الحقیقت اس کے لیے ضروری بھی ہوتی ہیں۔ ایک طرف وہ اپنے زراعتی میدانوں کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ نئی نئی صنعتوں کو بھی قائم کرنا چاہتا ہے۔ تو دوسری طرف وہ جہالت اور ناخواندگی کو بھی ختم کرنا چاہتا ہے۔ اسے ضرورت ہوتی ہے کہ وہ صحتِ عامہ سے متعلق خدمات کو عام کرے، سڑکیں، بجلی، ٹرانسپورٹ، نل کوپ، اسکول اسپتال اور اسی طرح کی دوسری سہولیات کی ملک میں فراوانی ہو۔ لیکن اس کے سامنے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ترقی پذیر ملک کی ضرورتیں لاتعداد ہوتی ہیں جب کہ اس کے وسائل بہت ہی محدود، اس کے پاس وقت بہت کم ہوتا ہے اور جدیدکاری کی آرزو و تمنا اس کے اضطراب و بے چینی کا باعث ہوتی ہے۔ جس میں قومی وقار، ہمسری اور مغربی اقوام سے وابستگی کے مسائل سب سے اہم ہوتے ہیں۔

ایک ترقی پذیر ملک کو عوامی ذرائع ترسیل کی اشد ضرورت ہوتی ہے، کیوں کہ قومی ترقی اور عوامی ذرائع ترسیل کی نشو و نما ایک دوسرے سے گہرے طور پر وابستہ ہیں۔ مثال کے طور پر پریس کو لیں۔ کوئی ملک جو اپنے پریس کو ترقی یافتہ بنانا چاہتا ہے اسے کئی چیزیں بہ یک وقت درکار ہوتی ہیں۔ جیسے نیوز پرنٹ، چھاپہ خانہ، سڑکیں اور نقل و حمل کے ذرائع، تعلیم یافتہ قاری، عوام کی قوت خرید وغیرہ وغیرہ۔ اس لحاظ سے اس فہرست میں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں معاشی ترقی، صحت اور عوامی فلاح و بہبود، تعلیم وغیرہ سے متعلق مسائل کے ساتھ ساتھ قومی ایکتا کے بھی مسائل ہوتے ہیں۔ ان تمام کاموں کو بہتر طور پر انجام دینے کے لیے عوامی ترسیل و ابلاغ کے باقاعدہ نیٹ ورک اور علوم و فنون کی اشاعت کے لیے ایک تجربہ کار اور تربیت یافتہ ٹیم کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ان تمام کاموں کی انجام دہی کے لیے وسائل ناکافی ہوتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی ملک کو ترقی کے لیے کچھ شعبوں کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے حکمت عملی تیار کرنی ہوتی ہے اور قومی ترقی میں ترسیل و ابلاغ سے جو توقع کی جاتی ہے، اس کے لیے ایک طریقۂ کار اور نظام کو متعین کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام چیزوں کے حصول کے لیے ایک قومی نظام کا مؤثر نیٹ ورک قائم کرنا لازمی ہے۔ سماج میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے اطلاعات و معلومات کی فراوانی، ترغیبی طریقۂ کار اور مستحکم اور باقاعدہ فیصلہ لینے کا عمل اہمیت کے حامل ہیں۔ معتدل ترقیات میں معاشرے کے سبھی طبقوں کو ایک ساتھ آگے بڑھانے کے لیے کوششیں کی جاتی ہیں۔ جب کہ غیر معتدل ترقیات میں صرف ایک میدان میں بیشتر، صنعت و حرفت کو اس یقین کے ساتھ اوّلیت دی جاتی ہے کہ اس سے معاشرے میں کسی دوسرے مقام پر بہتر ترغیب حاصل ہوگی۔ سہولت کے لیے منتخب ترقیات کی حکمت عملی کارگر ہوتی ہے جس میں ترسیل و ابلاغ کے نظام کے تحت منتخب افراد کو اس مقصد کے لیے تیار کیا جاتا ہے کہ وہ ایک استاد اور بہترین ماڈل کے طور پر اپنی ذمے داریوں کو پورا کرسکیں۔ یہ منتخب لوگ دوسرے لوگوں پر اثر انداز ہوں گے اسی طرح ترسیل و ابلاغ کا یہ دائرہ معاشی ترقی سے پرے اپنے مرکز سے باہر کی طرف پھیلتا جائے گا اور عام لوگوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گا۔(2)

اس رجحان کے پیشِ نظر کئی سوالات قائم ہوتے ہیں۔ وہ کون لوگ ہوں گے جو سماج میں تغیر و تبدّل کے لیے حکمتِ عملی تیار کریں گے؟ اس انتخاب کی بنیاد کیا ہوگی؟ لوگ کس سطح تک اور کس حد تک فیصلوں میں تعاون

● ذرائع ترسیل و ابلاغ کو جمہوریت کا چوتھا ستون تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں ترسیل و ابلاغ کے تمام اساسی نظریات، ترسیلی عمل، ذرائع ابلاغ، تہذیب و ثقافت، سماجی تبدیلی وغیرہ کا بخوبی احاطہ کیا گیا ہے جس کے مطالعے سے ترسیل و ابلاغ کے معنی و مفہوم، اس کے عمل اور تہذیب و ثقافت کے عمل دخل کو بہتر طور سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ماس میڈیا کے طلبہ کے لیے یہ حد اہم اور معلوماتی کتاب۔ 170 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 75 روپیے ہے۔ طالب علموں اور اساتذہ کو کونسل کی کتابوں پر 40% کی خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔

کریں گے؟ جمہوری و سیاسی دباؤ اور ترقیاتی منصوبوں کی راہ میں پیدا ہونے والی دشواریوں اور کشمکش کا تدارک کیسے کیا جائے گا۔؟ معاشرے کے متمول اور پسماندہ لوگوں کے درمیان قائم تفریق کو کس طرح ختم کیا جائے گا؟ سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیا کوئی خاص ترقیاتی عمل کارگر ثابت ہوگا؟ جدید کاری کا عمل عوامی ترسیل و ابلاغ کی وسعت سے تیز ہوجائے گا۔ اکثر و بیشتر دیکھا گیا ہے کہ مناسب اور مؤثر ابلاغی پروگرام کے باوجود جدید کاری کے منصوبہ بند طریقے لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوتے اور ان سے متوقع نتائج حاصل نہیں ہو پاتے ہیں۔ شیام چرن دوبے ایک مؤثر ابلاغی پروگرام کے انعقاد میں پیدا ہونے والی پریشانیوں اور دشواریوں کی فہرست سازی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ترسیل و ابلاغ کی حکمت عملیوں کا وقت محدود ہوتا ہے اور یہ کسی خاص نظام کے تحت عمل پیرا نہیں ہوتیں۔

اتصالی جال (Network) ناکافی ہوتا ہے۔

جدیدیت پسند چھوٹے خاندانی طبقے اور روایت پسند بڑے گروہوں کے درمیان بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

عوامی ذرائع ترسیل خاص طور پر ضعیف الاعتقاد لوگوں تک محدود ہیں۔

ترسیل و ابلاغ کے روایتی نیٹ ورک کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔

اس صورتِ حال کا علم بہت کم ہوتا ہے جس میں ترسیل و ابلاغ کے عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔

عوامی ذرائع ترسیل کا استعمال بہت کم کیا جاتا ہے۔

ترقی پذیر معاشرے میں ان کی حیثیت کو پوری طرح سمجھا نہیں جاتا۔

اور آخرکار ترقی پذیر ممالک جدید کاری کے اس واضح تصور سے محروم رہ جاتے ہیں جس کے لیے وہ کوشاں ہیں۔''(3)

جدید کاری کے لیے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے اس سلسلے میں ایک رائے نہیں ہے۔ اکثر لوگ اس تشویش میں مبتلا ہیں کہ جدید کاری اکثر حالات میں مغرب زدگی کے مترادف ہوتی جارہی ہے۔ کئی دانشور ترقی کے غیر مغربی ماڈل میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کے مطابق ترقی پذیر سماج خود اپنے تجربات سے ترقی کی نئی راہیں دریافت کرلیتا ہے۔ ترقی کی نئی جہات کے لیے ملک کے اشرافیہ یا مغربی صلاح کاروں کے نظریات کو تھوپنا نہیں چاہیے، بلکہ ترقیاتی نظام کو اساسی طور پر ملک کے باشندوں کے اجتماعی فیصلے کے ساتھ غور وفکر کرکے منتخب کرنا چاہیے۔ ان خیالات کی روشنی میں کچھ بنیادی سوال ضرور پیدا ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ نئے نظام کی شکل کیا ہو؟ تاکہ وہ طبقاتی اقدار اور ثقافت کے زاویے سے درآمد کیا ہوا محسوس نہ ہو اور ملک کے معاشرتی رسم ورواج اور معاشرتی نفسیات سے باہمی مطابقت رکھتا ہو۔ اس امر کو بھی ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اتفاقیہ ضرورتوں کے تحت لوگوں میں بیداری کیسے پیدا کی جائے؟ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ تکنیکی مہارت، انسانی مسائل اور مسلمات کے درمیان قائم تفریق کو کیسے کم کیا جائے تاکہ سماجی تبدیلی کا عمل بغیر کسی کشمکش اور تصادم کے جاری رہے۔ ہندستان اور دیگر ممالک میں مذہبی ادعائیت، لسانی اور علاقائی تعصبات اور جارحیت کے رجحانات وغیرہ ترقیاتی امور، سماجی تبدیلی، تعلیم اور ترسیل و ابلاغ کی ایک منصوبہ بند حکمت عملی نہ ہونے کی وجہ سے پائے جاتے ہیں۔ اس حکمت عملی کی عدم موجودگی یا اس میں موجود کوتاہیوں کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ حکمتِ عملی رائے عامہ کے مقابلے میں سیاسی نوعیت کی ہوتی ہے جس کو حکمراں طبقہ اور اس کے معاونین طے کرتے ہیں۔ جن کی تعلیم وتربیت، نظریہ اور مفادات، عام لوگوں کی توقعات اور معتقدات سے مختلف ہوتے ہیں۔ اگر اس تفریق میں زیادتی ہوجاتی ہے تو معاشرہ یا تو نراجیت کا شکار ہوجاتا ہے یا اقتداریت کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ اقتداریت پسند لوگ بدنظمی کا فائدہ اٹھا کر معاشرے کو اپنی مرضی کے مطابق چلانے لگتے ہیں جس سے سماجی تبدیلی کا عمل مجروح ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں عوامی ترسیل و ابلاغ عوامی بیداری کا ذریعہ نہیں ہوتے، بلکہ حکمراں طبقے کے لیے نشرواشاعت کا آلہ بن کر رہ جاتے ہیں۔

اتفاقی نوعیت کی ضرورتوں کے تحت لوگوں میں بیداری پیدا کرنا کسی تبدیلی کے عمل کو بروئے کار لانے یا اس میں شدت پیدا کرنے کے لیے بہت ہی اہم ہے۔ اس تبدیلی کے عمل میں جو رسم ورواج اور رویے حائل ہوتے ہیں انھیں عوامی ترسیل و ابلاغ کے ساتھ ساتھ بین شخصی ترسیل و ابلاغ کے ذریعے بدلنا یا ان میں اصلاحات کرنا ضروری ہے۔ یعنی اس کا مقصد یہ ہے کہ ثقافتی وابستگی، سماجی رشتے اور طبقاتی رسم ورواج کا بغور مطالعہ کرکے ان کی مدد سے ترسیل و ابلاغ کے نظام کو مستحکم کیا جائے۔

قومی ترقی میں سماجی تبدیلی کے لیے ترسیل وابلاغ کے عمل کی تین شکلیں ہوتی ہیں۔ (1) لوگوں کو قومی ترقی سے متعلق معلومات ہونا چاہیے (2) فیصلوں کے عمل میں انھیں غوروخوض کرنے اور ان میں شامل ہونے کے مواقع ملنا چاہئیں (3) ضروری مہارت کے لیے تربیت کا التزام ہونا چاہیے۔ اور تبدیلی کے عمل میں لوگوں کو ان کی مرضی سے بالفعل شامل کیا جانا چاہیے۔ اس طرح ترسیلی ذرائع کشادہ خاطری کے ساتھ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ترقی کے لیے سازگار ماحول پیدا کرنے کا کام کرسکتے ہیں۔ فیصلہ جاتی عمل میں ترسیلی ذرائع پختہ رویوں یا طور طریقوں کو بدلنے یا ان میں اصلاحات کرنے، اخلاقیات کے موضوع کو وسعت دینے اور صحیح معاشرتی رویوں پر زور دینے، دلچسپیوں میں اضافہ کرنے، تمام مستقل طریقوں پر اثرانداز ہونے اور پختہ رویوں کو صحیح سمت میں مہمیز کرنے میں بالواسطہ طور پر کام کرسکتے ہیں۔ ساتھ ہی ہر طرح کی تعلیم وتربیت سے متعلق امور کے التزام سے عوامی ذرائع

ترسیل ایک معلم کے فرائض بھی انجام دیتے ہیں۔

اس طرح عوامی ذرائع ترسیل معاشرتی وثقافتی تبدیلیوں، معاشی ترقی اور سیاسی بدلاؤ کے عمل میں ایک اساسی جز کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات خاص طور سے کہی جاسکتی ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں عوامی ذرائع ترسیل کے مقابلے عوامی تحریک اور ترسیل و ابلاغ کے طریقۂ کار کو زیادہ موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ ان ممالک میں حکمراں طبقہ اپنے خاص مقاصد اور ترجیحات کے لیے ان کا استعمال کرتا رہا ہے۔ اسکولوں اور دیگر مراکز میں رسمی تعلیم کے علاوہ زراعت، صحت وفلاح و بہبود اور تعلیم بالغان وغیرہ جیسی تحریکوں میں بھی ترسیل وابلاغ کے طریقۂ کار کو موثر ڈھنگ سے عمل آرا کیا جاتا ہے۔

لیکن جو ذمے داریاں عوامی ذرائع ترسیل پر عائد ہوتی ہیں انھیں وہ کتنے موثر اور منظم طور پر پورا کرسکتے ہیں۔ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس پر بڑی احتیاط کے ساتھ غوروخوض کرنے کی ضرورت ہے۔ یونیسکو کے مطابق بیشتر ترقی پذیر ممالک میں سہولتیں بہت کم ہیں۔ جن میں لاکھوں لوگ ابلاغ کی آزادی سے جزوی طور پر بھی بہرہ مند نہیں ہو پاتے ہیں۔ وسائل کی کمی کے علاوہ عوامی ذرائع ترسیل میں بڑے شہروں تک محدود ہونے کا رجحان ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ناخواندگی، تعلیم کی کمی، مذہبی ادعائیت اور غلط مسلمات، غریبی اور تدبیر وتقدیر پسندی وغیرہ امور ملک میں عوامی ترسیل و ابلاغ کے ذریعے نشر ہونے والے معنی خیز پیغامات کی اشاعت کی راہ میں حائل ہوجاتے ہیں۔ سرمائے کی کمی بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ کچھ مصنفین نے تو یہاں تک کہا ہے کہ غریب ملکوں کو ٹیلی ویژن اپنانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کیوں کہ معاشی نقطۂ نظر سے یہ ملک اس طرح کی سہولیات فراہم نہیں کرسکتے، اس آسائش کو صرف شان وشوکت کی علامت کے طور پر اپنانا ایک لغو بات ہے۔ ان کے خیال میں نئی اشیا خصوصاً سامان تعیش اور سامان شکوہ سے متعلق اشتہارات صارفیت پسندی کے رجحان کو مستحکم کررہے ہیں۔ یہ مصنوعی مانگ کو بڑھاوا دے کر معاشرے میں ایک تناؤ پیدا کررہے ہیں اور معاشی ترقی کو ایک غلط سمت دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ سستے اور بے مقصد تفریح ومشغلے کے سازوسامان فراہم کرکے لوگوں کو ثقافتی الجھن دے رہے ہیں۔ جن کے نتیجے میں مغربی ممالک کی پیروی کے رجحان کے ساتھ ساتھ ان کی ثقافتی بالادستی بھی بڑھ رہی ہے۔

جی سی اوستھی کے مطابق "ٹیلی ویژن سے متعلق جس مسئلے پر غور کرنا ہے وہ اس کے خرچ کا ہے۔ اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے یہ احتیاط برتنا ہوگا کہ ہم شان وشوکت سے متاثر نہ ہوں۔ کیوں کہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اکثر ممالک میں ٹیلی ویژن قومی وقار کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن کے حامی جس بات کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے یا شارع عام پر قبول نہیں کرتے وہ یہ ہے کہ مغربی ایشیا اور افریقہ کے اکثر مراکز تقریباً غیر ملکی سرمایہ کاری اور بہت ہی سوقیانہ فلموں پر منحصر ہیں۔۔۔ اگر ہندستان تجارتی ٹیلی ویژن کی شروعات کرتا ہے تو وہ اس کے بالواسطہ اور دوررس اثرات کے ساتھ چوہا دوڑ میں شامل ہوجائے گا۔ خاطر خواہ مقبولیت حاصل کرنے کے نتیجے میں فنی معیاروں میں کمی واقع ہونا بھی لازمی ہے۔ اس تناظر میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف قومی شکوہ کی بنیاد پر ٹیلی ویژن کی اس دوڑ میں کیوں شامل ہوا جائے؟ ایک دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ملک افراطِ زر اور مہنگائی کی موجودہ اقتصادی صورتِ حال میں ٹیلی ویژن جیسے سامان تعیش کو برداشت کرسکتا ہے۔"(4) ٹیلی ویژن سے متعلق یہ خیالات اس وقت کے ہیں (1965) جب ٹیلی ویژن اپنے ابتدائی دور میں تھا لیکن ان سوالات کی اساسی نوعیت پر غور کرنے کی ضرورت آج بھی ہے کیوں کہ حالیہ برسوں میں ٹیلی ویژن کو جو سیاسی اور تجارتی رخ دیا گیا ہے وہ باعث تشویش ہے۔

کوئی یہ بھی پوچھ سکتا ہے کہ جلدی کس بات کی ہے؟ حال ہی میں آزاد ہونے والے ممالک، جمہوری اداروں کے عملی ڈھانچے (Frame Work) میں بری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ جمہوریت کی کامیابی غربت و افلاس کے خاتمے پر منحصر ہے۔ اور منصوبہ بند ترقی کے لیے "لوگوں کے بخوشی تعاون" کرنے کا دھیما عمل زیادہ کارگر نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اس کا جھکاؤ نوکرشاہی (Bureaucratic) اور اکثر اقتداریت (Authoritarian) کی طرف ہوجاتا ہے۔ ہندستان میں عوامی ذرائع ترسیل کے سلسلے میں سرکاری کنٹرول اور خودمختار کارپوریشن کے درمیان اور پریس کی صنعتی خودمختاری اور نشرواشاعت کے مابین جو متنازع صورتِ حال ہے وہ "معاشرتی انصاف کے ساتھ ترقی" کے اس عمل کی پیچیدگی و پریشانیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ترسیل وابلاغ کی حکمت عملی کے سلسلے میں ہمارے ذہن صاف اور واضح ہونا چاہئیں تاکہ اس کے مطابق ابلاغی نظام کے دوسرے امور سے متعلق لازمی طور پر فیصلے لے لیے جائیں، ذرائع ترسیل کس حد تک خودمختار اور آزاد ہوں ان پر کس حد تک سرکاری ضبط وقابو ہو، ابلاغ کے جدید نظام کو چلانے کے لیے درکار ماہرین کی تربیت کیسے کی جائے؟ اور کیا ان کا استعمال عوامی پروپیگنڈے کے لیے کیا جاتا ہے یا یہ دانشورانہ بحث وتمحیص اور غوروخوض کرنے کا ایک وسیلہ ہیں؟ ترسیل وابلاغ پر غوروفکر کرتے ہوئے ان سوالات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

حواشی :

1. Ithiel de sola Pool: Communication and Development in Modernization: The Dynamics of Growth by Myron Weiner (ed).
2. Daniel Lerner and Wilbur Schramm (eds): Communication and Change in the Developing Countries.
3. S.C. Dube: Communication, Innovation and Planned Development.
4. G.C. Awasthy: Broadcasting in India.

سلمان عابد

انٹرنیٹ کے ذریعے عالمی کیریر

آج کا طالب علم حصولِ علم اور حصولِ روزگار کے لیے جغرافیائی حدود سے بالاتر ہوکر سوچتا ہے اور اس کے لیے عمل کرتا ہے۔ انسانی ضرورتوں پر مبنی تعلیمی پروگرام چاہے جس جگہ دستیاب ہوں انھیں حاصل کرنے کے لیے آج کا طالب علم پوری طرح کوشاں ہے۔ اور جب اس طرح کی تعلیم دسترس میں آجاتی ہے تو پھر اس سطح، اس نوعیت اور اس معیار کا روزگار بھی اس کی تلاش کے دائرہ کار میں آجاتا ہے۔

آج طالب علم دنیا کے کسی بھی گوشے میں حصولِ علم کے لیے آسانی کے ساتھ آجا رہا ہے اور اسی انداز سے حصولِ روزگار کے لیے کوشاں بھی ہے۔ بہتر سے بہترین تعلیمی پروگرام کی تلاش میں ملک کی کوئی سرحد نہ اسے روکتی ہے اور نہ یہ رکتا ہے۔ بالکل اسی طرح آج کا نوجوان دنیا کے کسی بھی گوشے میں اپنی صلاحیتوں کا فیض پہنچا کر اپنے آپ کو فیض یاب کرنا چاہتا ہے۔

عالمی سطح کے کیریر کی تلاش آج کے باشعور، باصلاحیت اور قابل طالب علم اور پروفیشنل کی عادت بن گئی ہے۔ ممکن ہے گزشتہ زمانوں میں اس طرح کی سوچ بھی بے حد عجیب لگتی رہی ہو مگر آج نہ صرف یہ سوچ بلکہ اس سوچ کے مثبت نتائج اکیسویں صدی کی نوجوان نسل کا حصہ بن گئے ہیں۔

چونکہ اکیسویں صدی انفارمیشن ٹکنالوجی، سائنس اور ٹکنالوجی کی جدید ترین دریافتوں اور ایجادات کی صدی بن کر ابھری اور اس کا ایک عملی و ظاہری نمونہ انٹرنیٹ کی شکل میں ملک کے چپے چپے میں ہر کس و ناکس کی دسترس میں آگیا ہے۔ گویا دنیا معلومات اور نتائج کی شکل میں سمٹ کر ہر فرد کی مٹھی میں آگئی ہے جس کی بدولت آج کے نوجوانوں کے لیے عالمی کیریر کی تلاش بے حد آسان اور بہت زیادہ ارزاں ہوگئی ہے۔

یہ معلومات طالب علم کی تعلیمی طلب اور حصولِ روزگار کی خواہش کی تکمیل کی ضامن ہوتی ہیں۔ انٹرنیٹ معلومات کا ایک سمندر ہے اور جب تک کسی خاص عنوان کے تحت انٹرنیٹ کی متعلقہ سائٹ معلوم نہ ہو تب تک تضیع وقت کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ہم یہاں طلبہ اور روزگار کی تلاش کرنے والے امیدواروں کی سہولت کے لیے انٹرنیٹ کی ان تمام ویب سائٹ کی مکمل تفصیلات پیش کر رہے ہیں جن کے توسط سے روزگار کے متلاشی اپنی منزلِ مقصود تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں۔

Country	Site	Address
Generic	AIESEC	1. http://www.au.aiesec.org/
Employment	Bilingual Jobs	2. http://www.bilingual-jobs.com/
Web sites	Career Builder	3. http://www.careerbuilder.com/
	Career Magazine	4. http://www.careermag.com/
	Escape Artist	5. http://www.escapeartist.com/
	Employment Resources on the Net	6. http://www.noncon.org/insight/jobs/
	Hobsons Global Careers & Education	7. http://www.hobsons.com/
	Idealist.Org	8. http://www.idealist.org/
	J-Hunter	9. http://www.j-hunter.com/
	Job Junt	10. http://www.job-hunt.org/
	Jobnet	11. http://www.jobnet.com.au/
	Jobs Abroad	12. http://www.jobsabroad.com/
	Monster Work Abroad	13. http://www.work.abroad.monster.com/
	Monster worlwide	14. http://www.monsterworldwide.com/

	News Directory	15.http://www.newsdirectory.com/news/press/
	Newspapers Online	16. http://www.newspapers.com/
	Overseas Jobs	17. http://www.overseasjobs.com/
	Quintessential Careers	18. http://www.quintcareers.com/
	TMP Hudson Global Resources	19. http://www.hudsonresourcing.com
	The Riley Guide	20. http://www.rileyguide.com/
	What you need to know about International Resources	21. http://jobsearch.about.com/cs/ internationaljobs1/
Africa	African Development Bank	22. http://www.afdb.org/
	Africa Online	23. http://www.africaonline.com/
	Career Junction	24. http://www.careerjunction.co.za/
	Careers.org - South Africa	25.http://www.careers.org/reg/cint-safrica.html
	Find a job in Africa	26. http://www.findajobinafrica.com/
	I-Africa Careers	27. http://careers.iafrica.com/
	Job Navigator	28. http://www.jobs.co.za/
Asia	Adecco Asia	29. http://www.adecco-asia.com/
	Asia Business Daily	30. http://www.asiabusinessdaily.com/
	Asian Development Bank	31. http://www.adb.org/
	Asia Employment Centre	32. http://jobs.asiaco.com/jobbank/
	Asia Inc Online	33. http://www.asia-inc.com/
	Asia Job Search Resources	34.http://www.escapeartist.com/jobs7/asia.htm
	Asia Net	35. http://www.asia-net.com/
	Asia Pacific Economic Cooperation	36. http://www.apec.org/
	Asia Partnership	37. http://www.asiapartnership.com/
	Asia Times	38. http://www.asiatimes.com/
	Asiaweek	39. http://www.asiaweek.com/asiaweek/
	Careerbuilder.com	40. http://www.careerbuilder.com/
	Far Eastern Economics Review	41. http://www.feer.com/
	J-Hunter	42. http://www.j-hunter.com/
	Job Asia	43. http://www.jobasia.com/
	Job Culture	44. http://www.jobculture.com/
	Jobs Database	45. http://www.jobsdb.com/
	Job Street Australasia	46. http://www.jobstreet.com/
	Recruit Asia	47. http://www.recruitasia.com/
	Wang & Li Asia Resource Online	48. http://www.wang-li.com/
Australia	Austrade	49. http://www.austrade.gov.au/
	Australian Business Limited	50. http://www.australianbusiness.com.au/
	Australian Federal Government	51. http://www.fed.gov.au/

	Austraian Job Search	52. http://www.jobsearch.gov.au/
	Australian Fiancial Review	53. http://www.afr.com/
	Australian Stock Exchange	54. http://www.asx.com.au/
	Australian Universities	55. http://www.avcc.edu.au/
	Career guide	56. http://www.yourcareerguide.com/
	Career One	57. http://www.careerone.com.au/
	CPA Australia	58. http://www.cpaaustralia.com.au/
	Dep't of Foreign Affairs & Trade	59. http://www.dfat.gov.au/
	Fairfax Classifieds	60. http://www.market.fairfax.com.au/
	Gradlink	61. http://www.gradlink.com.au/
	Graduate Opportunities	62. http://www.graduateoppotunities.com/
	Institute of Chartered Accountants	63. http://www.icaa.org.au/
	Job Watch	64. http://home.vicnet.net.au/
	Monster	65. http://www.monster.com.au/
	My Career	66.http://www.mycareer.com.au.editorial.graduate/
	My Future	67. http://www.myfuture.edu.au/
	SEEK	68. http://www.seek.com.au/
	SEEK Campus	69. http://campus.seek.com.au.
	The Age	70. http://www.theage.com.au/
	The Australian	71. http://www.theaustralian.com.au/
	Victorian Government	72. http://www.vic.gov.au/
	Visa Requirments	73. http://www.immi.gov.au/
	WageNet	74. http://www.wagenet.gov.au/
Austria	Adecco Austria (German)	75. http://www.adecco.at/
	Hill Waltron Recruitment (German)	76. http://www.hill-wiltron.com/
	Job Direct (German)	77. http://www.job-direct.co.at/
	jobnet Austria (German)	78. http://www.jobnet.uibk.ac.at/
	Job Pilot Austria (German	79. http://www.jobpilot.at/
	Manpower Austria (German)	80. http://www.manpower.at/
	Trenkwalder	81. http://www.trenkwalder.at/
Bangladesh	bangladesh Internet Resources	82. http://www.bdcenter.com/
	The Independent	83. http://www.independent-bangladesh.com/
Belgium	Belgiam Job Directory (Dutch)	84. http://www.info123.be/
	Job@ (Dutch)	85. http://www.jobat.be/
	Jobs and Careers Belgium	86. http://www.jobs-career.be/
	Jobs today	87. http://www.jobstoday.be/
	Vacature (Dutch & French)	88. http://www.vacature.be/
	VDAB	89. http://www.vdab.be/

Brunei	Brunei Government Site	90. http://www.brunei.gov.bn/
	Brunei News	91. http://www.bruneinews.net/
Cambodia	Business in Combodia	92. http://www.business-in-combodia.com/
	Cambodia News	93. http://www.combodia-web.net/
Canada	BC Workinfo Info	94. http://www.workinfonet.bc.ca/
	CACEE	95. http://www.cacee.com/
	Canada Careers	96. http://www.canadiancareers.com/
	Canada Employment Weekly	97. http://www.mediacorp2.com/
	Canadian Public Services	98. http://www.psc-cfp.gc.ca/index_e.htm
	Career & Immigration Tips	99. http://www.careertips.com/canada_ Economy.htm
	Dep't of Foreighn Affiars & Trade	100. http://www.dfait-maeci.gc.ca/
	Work Site Canada	101. http://www.worksitecanada.com/
	Workapolis	102. http://www.workapolis.com/
Caribbean	Caribbean Hello	103. http://www.caribbeandaily.com/
	The Daily Herald	104. http://www.thedailyherald.com/
China	Australian China Business Coundcil	105. http://www.acbc.com.au/
	Beijing Review	106. http://www.bjreview.com.cn/
	Business Directory of China	107. http://www.china-business-directory.com/
	Career Agent China	108. http://china.career-agent.net/
	China Daily	109. http://chinadaily.com.cn/
	China News Digest	110. http://www.cnd.org/
	China Vista	111. http://www.chinavista.com/
	China HR	112. http://www.chinahr.com/
	China Window	113. http://www.china-window.com.cn/
	Chinese Newspapers Online	114. http://www.lib.duke.edu/ias/eac/chnsp.htm
	Fujian	115. http://www.fz.fj.cn/
	Guangzhou Ribao	116. http://www.gmw.com.cn/
	Inside China Today	117. http://www.einnews.com/china/
	People's Daily	118. http://www.snweb.com/
	South China Morning Post	119. http://www.scmp.com/
	Wen Hui Daily	120. http://www.whb.com.cn/
	Zhaopin	121. http://www.zhaopin.com.cn/
Czech Republic	CV Online (Czech)	122. http://www.cvonline.cz/
	Czech Jobs (Czech)	123. http://www.jobs.cz/
	Department of Foreighn Affiairs	124. http://www.czech.cz/
	Hot Jobs (Czech)	125. http://www.hotjobs.cz/

	Job European Job Sites	126. http://www.1job.net/
	Jobmaster (English and Czech)	127. http://www.jobmaster.cz/
Denmark	EURES (English & Danish)	128. http://www.eures.dk/
	Job Bank (Danish)	129. http://www.jobbank.dk/
	Job Denmark (Danish)	130. http://www.jobdanmark.dk/
	Job Guide (Danish)	131. http://www.job-guide.dk/
	Job Index (Danish)	132. http://www.jobindex.dk/
Europe	Career Builder	133. http://www.careerbuilder.com/
	Careers Europe	134. http://www.careers.co.uk/
	EURES	135. http://www.europa.eu.int/jobs/eures/
	Euro-graduate	136. http://www.eurograduate.com/
	European Union	137. http://www.europa.eu.int/
	IAgora-iwork	138. http://www.iagora.com/
	Job Pilot	139. http://www.jobpilot.com/
	Job Site	140. http://www.jobsite.co.uk/
	Step Stone	141. http://www.stepstone.com/
Fiji	Fiji Online	142. http://www.fiji-online.com.fj/
	Fiji Trade Contacts	143. http://www.fiji-online.com.fj/business/
Finland	Aamulehti Newspaper (Finnish)	144. http://www.Aamulehti.fi/tyopaikat/
	Academic Caree Services in Finland	145. http://www.minedu.fi/
	Academic Career Services	146. http://www.aarresaari.net/english/
	Ministry of Labour	147. http://www.mol.fi/tyopaikat/
	PIB	148. http://www.pib.fi/
France	NNPE (French)	149. http://www.anpe.fr/
	Experian en France	150. http://www.experian.fr/carriere/job.htm
	French-Aust, Chamber of Commerce	151. http://www.facci.com.au/
	French Employment Directory	152. http://www.jobpilot.fr/
	French News and Employment	153. http://www.wanadoo.fr/
Germany	Berlitz (Teaching English)	154. http://www.berlitz.com/
	Die Zeit Jobs	155. http://www.jobs.zeit.de/
	Job Exchange	156.http://www.hueber.de/german/jobs/index.asp
	Stellen Market (German)	157. http://www.stellenmarkt.de/
	Student Employment in Germany	158. http://www.careernet.de/
Greece	Athens News	159. http://www.athennews.gr/
	OAED	160. http://www.oaed.gr/mainenglish.htm
	Skywalker Job Search	161. http://www.skywalker.gr/
Hong Kong	Career Times Hong Kong	162. http://www.careertimes.com.hk/
	Chinese University of Hong Kong	163. http://www.cuhk.edu.hk/
	Classified Post	164. http://www.classifiedpost.com.hk/

	Gemini Personnel Ltd.	165. http://www.gemini.com.hk/
	HKU Careers Service	166. htt://www.hku.hk/cepc/
	Hong Kong Jobs	167. http://www.hkjobs.com/
	Hong Kong Polytechnic University	168. http://www.polyu.edu.hk/
	Hong Kong Trade Dev't Council	169. http://www.tdctrade.com/
	Hong Kong Ui Employers	170. http://www.hku.hk/cepc/service/ com_name.htm
	Ming Pao Daily News	171. http://www.mingpaonews.com/
	Recruit Online with Panda Planet	172. http://www.pandaplanet.com/
	Sing Tao	173. http://www.singtao.com/
	South China Morning Post Careers	174. http://careers.scmp.com/
	Ta Kung Pao	175. http://www.takungpao.com.hk/
Iceland	Jobs Iceland	176. http://www.job.is/atvinnutorg/
India	SIASAT	177. http://www.siasat.com/
	Jagran	178. http://www.jagran.com/
	Deccan Chronicle	179. http://www.deccan.com/
	Deccan Herald	180. http://www.Deccanherald.com/
	Economic Times	181. http://www.economictime.com/
	Express India	182. http://expressindia.com/
	India Connect	183. http://www.indiaconnect.com/
	India Govt. Home Page	184. http://www.alfa.nic.in/
	India Server	185. http://www.indiaserver.com/
	India World	186. http://www.indiaworld.com/
	INDOlink	187. http://www.indolink.com/
	Jobs Ahead	188. http://www.jobsahead.com/
	Kerala Home Page	189. http://www.keral.com/
	Naidunia	190. http://www.naidunia.com/
	Net Guru India	191. http://www.netguruindia.com/
	News India-Times	192. http://www.newsindia-times.com/
	Sanjevani	193. http://www.sanjivani.com/
	The Hindu	194. http://www.hinduonline.com/
	The Statesman	195. http://www.thestatesman.net/
	The Telegraph	196. http://www.telegraphindia.com/
	Times of India Jobs and Careers	197. http://www.timesjobsandcareers.com/
	NAUKRI	198. http://www.naukri.com/
	MESCO	199. http://www.mescoeducation.com/
Indonesia	Australia Indonesia Business Council	200. http://www.aibc.net.au/
	Bali Post Online	201. http://www.balipost.co.id/

	Bisnis Indonesia	202. http://www.bisnis.com/
	Bernas	203. http://www.indomedia.com/bernas/
	Indobiz	204. http://www.indobiz.com/
	indoWEB	205. http://www.indoweb.com/
	Dep't of Foreighn Affairs Indonesia	206. http://www.dfa-deplu.go.id/
	Indonesia Government Homepage	207. http://www.ri.go.id/
	Indonesia Professional Associations	208. http://www.dnet.net.id/ipa/
	Kompas Cyber Media	209. http://www.Kompas.com/
	Living in Indonesia- for Expatriates	210. http://www.expat.or.id/
	Media INdonesia Online	211. http://www.mediaindo.co.id./
	Pikiran Rakyat	212. http://www.pikiran-rakyat.com/
	Republika Online	213. http://www.republika.co.id./
	Suara Merdeka	214. http://www.suaramerdeka.com/
Ireland	AA Ireland	215. http://www.aaireland.ie/jobs/
	Irish Jobs	216. http://www.irishjobs.ie/
	NI Jobs	217. http://www.nijobs.com/
	Nixers	218. http://www.nixers.com/
	Recruit Ireand	219. http://www.recruitireland.com/
	The Irish Times	220. http://www.ireland.com/
Israel	Aust. - Israel Chamber of Commerce	221. http://www.aicc.org.au/
	Marksman International Personnel	222. http://www.Marksman.co.il/
	The Jerusalem Post Daily	223. http://www.jpost.co.il/
Italy	Adecco Italia	224. http://www.adecco.it/
	Corriere della Sera (Rome)	225. http://www.Corriere.it/
	Italian and International Jobs	226. http://www.joblinks.f2s.com/
	Job Pilot (Italian)	227. http://www.jobpilot.it/
	Job Online	228. http://www.jobonline.it/
	Talent Manager	229. http://www.talentmanager.it/
Japan	Agara	230. http://www.agara.co.jp/
	Asahi Shimbun (Tokyo)	231. http://www.asahi.com/
	Chugoku Shimbun (Hiroshima)	232. http://www.chugoku-np.co.jp/
	Gaijinpot	233. http://www.gaijinpot.com/
	Hokkoku Shimbun	234. http://www.hokkoku.co.jp/
	Inegenium	235.http://www.ingeniumgroup.com/indexe.asp
	Inter Career Net Japan	236. http://www.intercareer.com/japan/
	Japan Newspapers & Media Online	237. http://www.sabotenweb.com/bookmarks/newspapers.html
	Japan Times (Tokyo)	238. http://www.japantimes.co.jp/
	Job Dragon	239. http://www.jobdragon.com/index_e.asp

	Mainichi Interactive	240. http://www.mainichi.co.jp/
	Nara Shimbun	241. http://www.nara-shinbun.com/
	Nikkei	242. http://www.nikkei.co.jp/
	Nikkan Koyko Shimbun	243. http://www.nikkan.co.jp/
	Nishinippon Shimbun	244. http://www.nishinippon.co.jp/.
	O Hayo Sensei (Teaching)	245. http://www.ohayosensei.com/
	Okinawa Times	246. http://www.okinawatimes.co.jp/
	Pacific Stars and Stripes	247. http://www.estripes.com/
	Ryukyu Shimpo	248. http://www.ryukyushimpo.co.jp/
	Tokyo Stock Exchange	249. http://www.tse.or.jp/
	Yomiuri Online	250. http://www.yomiuri.co.jp/
Latin America	Jobs in Latin America	251. http://www.latpro.com/
Luxembourg	HVB Luxembourg	252. http://www.hvb.lu/en/jobs/
	ADEM	253. http://www.etat.lu/adem/
Malaysia	Graduan	254. http://www.graduan.com.my/
	Daily Express	255. http://www.infosabah.com.my/
	JARING	256. http://www.jaring.my/
	Jobstreet	257. http://www.job.com.my/
	Kuala Lumpur Stock Exchange	258. http://www.klse.com.my/
	Malaysia Online	259. http://www.mol.net.my/
	Manfield in Malaysia & Singapore	260. http://www.manfield.com.sg/
	Sarawak Tribune	261. http://sarawaktribune.com.my/
	Star Jobs	262. http://star-jobs.com/
	Wencom Career Guide	263. http://www.jaring.my/wencom/career.htm
Mauritius	L'Express	264. http://www.lexpress.mu/
	Le Mauricien	265. http://www.lemauricien.com/mauricien/
Middle East	Bayt	266. http://www.bayt.com/
	Careers Emirates	267. http://www.careeremirates.com/
	Gulf Job Sites	268. http://www.gulfjobsites.com/
Nepal	Nepalese Newspapers	269. http://www.south-asia.com/
Netherlands	Dambusters Recruitment	270. http://www.dambustersrecruitment.com/
	English Language Jobs in Holland	271. http://www.englishlanguagejobs.com/
	Jobs Today Directory (Dutch)	272. http://www.jobstoday.nl/
	Jobsnews (Dutch)	273. http://www.jobnews.nl/
	JobTrach (Dutch)	274. http://www.jobtrack.n./
	Van Zoelen Recruitment	275. http://www.vz-recruitment.nl/
New Zealand	Best Jobs New Zealand	276. http://www.bestjobsnz.com/
	Kiwi Careers	277. http://www.careers.co.nz/

Norway	EMB Net	278. http://www.no.embnet.org/jobs/index.php3
	FINN	279. http://www.finn.no/
	Norge Jobbguiden	280. http://www.jobguiden.no/
	Rekruiteringssystemer AS	281. http://www.rekrutteringssystemer.no/
Pakistan	Business Recorder	282. http://www.brecorder.com/
	News International	283. http://www.jang-group.com/thenews/
	The Dawn	284. http://dawn.com/
Phillippines	Australian-Phillppines Business Council	285. http://www.apbc.org.au/
	Business World	286. http://bworld.com.ph/
	Chinese Commercial News	287. http://www.siongpo.com/
	Filipino Express	288. http://www.filipinoexpress.com/
	Filipino Online Job Hunting	289. http://www.trabaho.com/
	Manila Bulletin	290. http://www.mb.com.ph/
	Philippines Times	291. http://www.philippinespost.com/
	Philippine Star	292. http://www.philistar.com/
	Visayan Daily Star	293. http://www.visayandailystar.com/
Partugal	Emprego (Jobs) (Portuguese)	294. http://emprego.aeiou.pt/
	IEFP	295. http://www.iefp.pt/
	Jobs Express (Portuguese)	296. http://www.expressoemprego.pt/
	Portugal Jobs	297. http://portugal-info.net/jobs/deletejob.htm
	Talent 4 Europe	298. http://www.talent4europe.com/portugal/jobs.htm
Poland	Job Pilot (Polish)	299. http://www.jobpilot.com.pl/
	Palandjobs.com	300. http://www.polandjobs.com/
	Top Jobs (Polish)	301. http://www.topjobs.pl/
Romania	Best Jobs Romania	302. http://bestjobs.neogen.ro/
	Jobsearch Romania (Romania)	303. http://www.jobsearch.ro/index.cfm
	Romania Jobsearch Portal	304.http//addbusiness.hyperart.net/employment/
Russia	Human Resource Online Russia	305. http://www.hro.ru/
	Russsia Today	306. http://www.russiatoday.com/
	St. Peterburg Times	307. http://www.sptimes.ru/
Singapore	Asia One	308. http://www.asia1.com.sg/
	Alpha Maps	309. http://www.alpha-maps.com/
	Business Times	310. http://business-times.asia1.com.sg/
	Career Zone - Jobs in Singapore	311. http://www.careerzone.com.sg/
	Contract Singapore	312. http://www.contactsingapore.org.sg/
	Job Bank	313. http://www.adpost.com/sg/job_bank/
	Lianhe Zaobao	314. http://www.asia1.com.sg/zaobao/

	Manpower Singapore	315. http://www.manpower.com.sg/
	Nanyang Polytechnic	316. http://www.nyp.edu.sg/
	National University of Singapore	317. http://www.nus.edu.sg/
	Singtao Times	318. http://www.singtao.com/
	Shipoing Times	319. http://business-times.asia1.com.sg/shippingtimes/
	Singapore Chamber of Commerce	320. http://www.sicc.com.sg/
	Singapore Government	321. http://www.gov.sg/
	Singapore Information Map	322. http://www.sg/
	Singapore Stock Exchange	323. http://www.ses.com.sg/
	The Straits Times	324. http://straitstimes.asia1.com.sg/
	9 to 5 Asia	325. http://coldfusion.9to5asia.com/
South Koria	Chosun Daily News	326. http://www.chosun.com/
	Chungang Libo	327. http://www.joins.com/
	Dong A llbo	328. http://www.donga.com/
	Han-Kyoreh Shinmum	329. http://www.hani.co.kr/
	Korean News Service	330. http://www.nowcom.co.kr/
	Korea Post	331. http://www.koreapost.com/
	Koreatimes	332. ttp://www.korealink.co.kr/times/times.htm
	Maeil Shinmun	333. http://www.m2000.co.kr/
	Munhwa llbo	334. http://www.munhwa.co.kr/
	The Korea Herald	335. http://www.koreaherald.co.kr/
Spain	Terra (Spanish)	336. http://www.terra.es/
	Trabajos (Spanish)	337. http://www.trabajos.com/
	Todo Trabajo (Spanish)	338. http://www.todotrabajo.com/
	Trabajo.org (Spanish)	339. http://www.trabajo.org/
Sri Lanka	Daily News	340 .http://www.dailynews.lk/
	Lanka Academic Network	341. http://www.lacnet.org/
	Sri Lanka Server	342. http://www.lanka.net/
	Tamil Eelam News (Tamil)	343. http://www.eelam.com/news/tamil/
Sweden	AMS	344. http://www.ams.se/englishfs.asp?C1=223
	I see Head Hunting & Consulting	345. http://www.isee.se/
	Jobline	346. http://www.jobline.se/
	Manpower Sweden (Swedish)	347. http://www.manpower.se/
	Proffice (Swedish)	348. http://www.profice.se/
	Swednet Job Search	349. http://www.swednet.org.uk/
	Temporary Office Work In Sweden	350. http://www.profice.com/
Switzerland	Emploi Switzerland	351. http://emploi.ch/

	Job Engine	352. http://www.jobengine.ch/
	Swiss Info	353. http://www.swissinfo.org/
	Swiss Jobs	354. http://www.swissjobs.ch/
	Swiss Web Jobs	355. http://www.jobs.ch/
	Top Jobs Switzerland	356. http://www.topjobs.ch/
Taiwan	China Economic News Service	357. http://cens.com/
	China Times	358. http://www.chinatimes.com.tw/
	Jobs DB.com	359. http://www.jobsdb.com.tw/
	SinaNet Taiwan News	360. http://www.sinanet.com/
	Taiwan Jobs Center	361. http://jobs.asiaco.com/taiwan
	Taiwan Stock Exchange	362. http://www.tse.com.tw/
	Taiwan Tribune	363. http://www.taiwanese.com/
Thailand	Bangkok Post Jobs	364. http://www.bangkokpostjobs.com/
	Business Day	365. http://bday.net/
	Phuket Gazette	366. http://www.phuketgazette.net/
	Siam Jobs - Resume/Jobs database	367. http://www.siam.net/jobs/
	Thai Aust. Chamber of Commerce	368. http://www.austchamthailand.com/
	Thailand Business	369. http://www.accessasia.com/xroad/ xrthbus.html
UK	Academic Jobs	370. http://www.jobs.ac.uk/
	ASA Education (Teaching inUK)	371. http://www.asaeducation.com/
	BBC News Online	372. http://news.bbc.co.uk/
	Celsian Group	373. http://www.celsiangroup.com/
	Daily Record	374. http://www.dailyrecord.co.uk/
	Financial Times	375. http://www.ft.com/
	Fish 4 - Jobs	376. http://www.fish4.co.uk/
	IC Resources	377. http://www.ic-resources.co.uk/
	Job Mail	378. http://www.jobmail.co.uk/
	Jobsearch	379. http://www.jobsearch.co.uk/
	Jobserve	380. http://www.jobserve.co.uk/
	Microscape Recruitment Ltd	381.http://www.microscape.co.uk/welcome.asp
	Net Job	382. http://www.netjobs.co.uk/
	Planet Recruit	383. http://www.planetrecruit.com/
	Prospects	384. http://www.prospects.ac.uk/
	SEEK UK	385.http://www.seek.com.au/if.asp?loc=ukjobs
	Technojobs Uk	386. http://www.technojobs.co.uk/
	Telegraph Newspaper Online	387. http://www.telegraph.co.uk/
	The Guardian - Jobs	388. http://jobs.guardian.co.uk/

	The Monster Board, UK	389. http://www.monster.co.uk/
	The Times	390. http://www.timesonline.co.uk/
	Top Jobs	391. http://www.topjobs.co.uk/
USA	Adguide's College Recruiter	392. http://www.adguide.com/
	Financial Times	393. http://www.usa.ft.com/
	Internship Program	394. http://internships.wetfeet.com/
	Job Hunt	395. http://www.job-hunt.org/
	Jobweb	396. http://www.collegejournal.com/
	Nation Job Network	397. http://www.nationjob.com/
	Net Temps	398. http://www.net-temps.com/
	The New York Times	399. http://www.nytimes.com/
	The Wall Street Journal - College	400. http://www.collegejournal.com/
	USA Today	401. http://www.usatoday.com/
	US Government official Site	402. http://www.usajobs.opm.gov/
Vietnam	Vietnam Works	403. http://www.vietnamworks.com/
United Arab Emirates	Jobs in Dubai	404. http://www.jobsindubai.com/
	The Emirates Network	405. http://www.theemiratesnetwork.com/business/jobs.htm
International Organisations	OECD	406. http://www.oecd.org/
	Inter-American Development Bank	407. http://www.iadb.org/
	International Labour Organisation	408. http://www.ilo.org/
	International Monetary Fund	409. http://www.imf.org/
	Red Cross	410. http://www.redcross.org/
	UNESCO	411. http://www.unesco.org/
	United Nations	412. http://www.un.org/
	The World Bank Group	413. http://www.worldbank.org/
	World Health Organisation	414. http://www.who.org/
	World Trade Organisation	415. http://www.wto.org/
	Worldwide Corporate Information	416. http://www.corporateinformation.com/

قومی اردو کونسل نے نہ صرف حوالہ جاتی بلکہ اعلا درجات کی ضرورتوں کے مطابق درسی کتابیں شائع کی ہیں۔

طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40%کی خصوصی رعایت

تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جاتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، ونگ-6، نئی دہلی-110066

شفقت علی

فرنٹ پیج شروع کرنا

فرنٹ پیج کیا ہے؟

ویب مختلف ویب سائٹس سے بھرا ہوا ہوتا ہے جو ویب پیجز سے مل کر بنتی ہیں اور یہ ویب پیجز HTML کو استعمال کرتے ہوئے بنائے جاتے ہیں۔ پھر فرنٹ پیج کا اس میں کیا کردار ہے؟ فرنٹ پیج، ویب بنانے (Web Authoring) اور ویب نشر کرنے والا (Web Publishing) پروگرام کہلانے والے سافٹ ویئر کی ایک قسم ہے۔ ویب نشر والے پروگرام ہر ایک کو ویب بنانے کی سہولت مہیا کرتے ہیں حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی جو HTML جاننا نہیں چاہتے یا جن کے پاس اسے جاننے کا وقت نہیں ہے۔

فرنٹ پیج یہ سہولت دیتا ہے کہ مشہور ورڈ پروسیسنگ کے پروگراموں کی طرح ویب پیجز بنا سکیں۔ مثلاً مینوز اور ٹول بار بٹن استعمال کرتے ہوئے تحریر، تصاویر اور پیج کے دوسرے اجزا پیج میں ڈال اور فارمیٹ کر سکتے ہیں۔ ڈالے ہوئے اجزا کے مطابق فرنٹ پیج خود ہی پیج کے پیچھے HTML ٹیگ بنا دیتا ہے۔ اس طریقہ کار کو What-You-See-Is-What-You-Get کہا جاتا ہے جس کا مخفف WYSIWYG ہے اور اس کا تلفظ wiz-ee-wig بنتا ہے۔ فرنٹ پیج صرف ویب پیجز بنانے میں ہی مدد نہیں کرتا بلکہ یہ مستقل تبدیل ہونے والے اسٹرکچر اور پوری سائٹ کے اجزا کو منظم بھی کرتا ہے۔

ٹیمپلیٹس کو استعمال کرتے ہوئے سائٹ بنانا

فرنٹ پیج ٹیمپلیٹس کی شکل میں مکمل رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ٹیمپلیٹس پہلے سے سیٹ شدہ پیجز ہوتے ہیں جہاں پر تمام مطلوبہ اشیا مثلاً تحریر وغیرہ ڈال سکتے ہیں اور اگر ضروری ہو تو گرافکس میں بھی تبدیلی کر سکتے ہیں۔ فرنٹ پیج ٹیمپلیٹس کی مختلف اقسام فراہم کرتا ہے جن میں Customer Suport اور Project Personal شامل ہیں۔ ان میں ایک One Page ٹیمپلیٹ بھی شامل ہے جسے ایک پیج پر مشتمل ویب سائٹ بنانے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک empty ویب بھی شامل ہے جس سے ویب اسٹرکچر تو بن جاتا ہے لیکن صفحہ خالی سامنے آتا ہے جس میں آپ مطلوبہ چیزیں ڈال سکتے ہیں۔ آپ پہلے سے بنی ٹیمپلیٹس میں تبدیلی کر کے یا اسکریچ کی مدد سے نئی بنا کر ذاتی ٹیمپلیٹس بھی بنا سکتے ہیں۔

ٹیمپلیٹس آپس میں منسلک پیجز بناتی ہیں جن میں تحریر موجود ہوتی ہے۔ آپ اس کے اجزا اور ڈیزائن کو تبدیل کر کے اپنی مرضی کے پیجز بنا سکتے ہیں۔

ایک پہلے سے موجود ٹیمپلیٹ کو استعمال کرتے ہوئے ویب سائٹ بنانے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات پر عمل کریں۔

1- فرنٹ پیج کی مینو بار میں موجود File کے مینو سے New چنیں اور اس کے سائیڈ مینو سے Web کی کمانڈ پر کلک کریں۔

2- آپ کے سامنے New کا ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا جس میں ٹیمپلیٹس نظر آ رہی ہوں گی۔

3- کسی ایک Personal Web کے آئیکان پر کلک کریں۔ ڈائیلاگ باکس کے دائیں طرف موجود ڈراپ ڈاؤن لسٹ میں آپ ویب کی جگہ کا تعین کرتے ہیں۔ اس سے نئے بنائے جانے والے ویب کی فائلیں رکھنے کے لیے ہارڈ ڈسک میں پہلے سے موجود کوئی ڈائرکٹری چن سکتے ہیں یا نئے سرے سے بنا سکتے ہیں۔

OK-4 پر کلک کریں۔ ایک یا دو منٹ کے بعد نئی ویب سائٹ تیار ہو جائے گی۔

فرنٹ پیج کے ویوز کی سرخی تلے فرنٹ پیج کے مہیا کردہ تمام ویوز پر بحث کی گئی ہے جو ہر ویو کو مختلف طریقے سے ویب سائٹ بنانے، اس کی تنظیم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کی سہولت دیتا ہے۔ پیج کو دیکھنے کے لیے Folders ویو منتخب کریں اور default.htm نامی فائل پر ڈبل کلک کریں۔

نوٹ: فرنٹ پیج جو فائلیں بناتا ہے ان کی ایکس ٹینشن html. کی بجائے htm. دیتا ہے اور اسی طرح ہوم پیج کا نام index.html کی بجائے default.htm دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ کمپیوٹرز ایسا آپریٹنگ سسٹم استعمال کرتے ہیں جو صرف تین ہندسوں تک ایکس ٹینشن دینے کی اجازت دیتا ہے۔ اسی طرح زیادہ تر سرورز index.html کی بجائے default.htm کو سپورٹ کرتے ہیں۔

وزرڈز کو استعمال کرتے ہوئے سائٹ بنانا

فرنٹ پیج اپنی پیچیدہ ٹیمپلیٹ Corporate Presence Web کے لیے وزرڈز فراہم کرتا ہے۔ وزرڈ، پروگرام کے اندر ایک چھوٹا پروگرام ہوتا ہے جو مطلوبہ ویب سائٹ مرحلہ وار طریقے سے بناتا ہے۔ کارپوریٹ پریسنس ویب وزرڈ ایک پوری کارپوریٹ سائٹ بنانے کے مراحل سے گزارتا ہے جس میں وہ آپ سے سائٹ میں دینے والی معلومات کی قسم پوچھتا ہے۔ وزرڈ آپ

سے مطلوبہ باتیں پوچھنے کے بعد ویب سائٹ بنا دیتا ہے۔ وزرڈ کو استعمال کرتے ہوئے سائٹ بنانے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کی پیروی کریں۔

1- فرنٹ پیج چلائیں اور اس کی مینو بار میں موجود File کے مینو سے New چنیں اور اس کے سائیڈ مینو سے Web کی کمانڈ پر کلک کریں۔

2- جب New کا ڈائیلاگ باکس ظاہر ہو تو اس میں سے Corporate Presence Web Wizard چنیں اور OK پر کلک کریں۔ وزرڈ ظاہر ہو جائے گا۔

3- تعارف پڑھنے کے بعد اگلے پینل پر جانے کے لیے Next بٹن پر کلک کریں۔ اس مرحلے میں وزرڈ پوچھے گا کہ کونسے پیج ویب میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ پیج کی قسم سے پیچھے چیک باکس پر لگا نشان ختم کرنے سے کسی پیج کو فہرست سے نکال سکتے ہیں اور نشان لگا کر کسی پیج کو شامل کر سکتے ہیں۔ جب پیجز منتخب کر لیں تو Next پر کلک کر دیں۔

4- اب وزرڈ ویب کے لیے ایک ٹائٹل مانگے گا۔ اس میں ایک ایسا ٹائٹل دیں جو واضح اور سائٹ میں شامل کرنے والی معلومات سے مطابقت رکھتا ہو۔

5- ہر پینل میں وزرڈ کی ہدایات پڑھیں اور اس پر عمل کریں۔ اگلے پینل پر جانے کے لیے Next اور پچھلے پینل پر واپس آنے کے لیے Back بٹن استعمال کریں۔

6- جب آخری پینل پر پہنچیں گے تو Next کا بٹن ڈم یعنی مدھم ہو جائے گا۔ ویب وزرڈ ختم کرنے کے لیے Finish کے بٹن پر کلک کریں۔ وزرڈ آپ کی فراہم کردہ معلومات کو ویب بنانے میں استعمال کرے گا۔ جب ویب بن جائے تو اسے پیج ویو میں دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے لیے Folders ویو بٹن پر کلک کریں اور پھر default.html فائل پر کلک کریں تو وزرڈ سے بننے والا پیج ظاہر ہوگا۔ جب وزرڈ ویب مکمل کر دے تو آپ مختلف پیجز میں موجود اجزا میں تبدیلی کرنے کے لیے انھیں کھول سکتے ہیں۔

فرنٹ پیج کے ویوز (Views)

جب فرنٹ پیج میں ویب کھلا ہوتا ہے تو اسے مختلف طریقوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے فرنٹ پیج کے مہیا کردہ ویوز استعمال ہوتے ہیں۔ یہ ویوز ونڈو کے بائیں طرف Views ٹول بار پر آئیکانز کی شکل میں واقع ہوتے ہیں۔

پیج ویو (Page View)

پیج ویو کو ایڈیٹر ویو بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ آپ کو پیج کے اجزا اور آئٹمز میں تبدیلیاں اور سیٹنگ کرنے کی سہولت دیتا ہے۔ پیج ویو میں رہتے ہوئے آپ پیج کے اجزا پر رائٹ کلک کے مینو کے ذریعے تبدیلی کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ مینو بار کے نیچے موجود ٹول بار کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ پیج ویو کا ایک اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ آپ نیچے بار پر موجود ایڈیٹنگ کے خانوں یا موڈز کو استعمال کر سکتے ہیں۔

یہ ایڈیٹنگ موڈز مندرجہ ذیل ہیں:

Normal: یہ اسٹینڈرڈ ایڈیٹنگ موڈ ہے۔

HTML: اس موڈ میں آپ پیج کے پیچھے کام کرنے والے HTML کوڈ کو دیکھ اور تبدیل کر سکتے ہیں۔ تبدیلیاں کرنے کے بعد Normal موڈ میں ان تبدیلیوں کے اثرات کا جائزہ لے سکتے ہیں۔

Preview: اس موڈ میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ پبلش ہو کر آپ کا پیج کیسا لگے گا۔ یہ پیج کے حتمی نتائج ظاہر کرتا ہے جس میں کوڈ یا ایڈیٹنگ نشانات شامل نہیں ہوتے۔

پیج ویو کی بہت اہمیت ہے کیونکہ اس میں نہ صرف آپ ظاہری اڈجسٹمنٹس میں تبدیلیاں کر سکتے ہیں بلکہ HTML کوڈ میں بھی تبدیلیاں کر سکتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ پیج کا پری ویو بھی لے سکتے ہیں۔

فولڈرز ویو (Folders View)

فولڈرز ویو کو دو خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ بائیں خانے میں موجودہ ویب کے اندر موجود ڈائرکٹری اسٹرکچر ظاہر ہوتا ہے جبکہ دائیں خانے میں منتخب شدہ فولڈر کے اندر پیجز اور فائلوں کی تفصیلی لسٹ موجود ہوتی ہے۔

اس ویو کو فائلوں کی تنظیم کے کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں مثلاً فائلوں کے نام تبدیل کرنا، نئے فولڈر بنانا اور پیجز کو سب فولڈرز میں ڈریگ کر کے پھینکنا وغیرہ۔ کسی ویب فائل کی جگہ یا نام تبدیل کرنے سے فرنٹ پیج خود بخود پوری سائٹ میں موجود اس فائل سے متعلقہ لنکس کو تبدیل کر دیتا ہے۔

فرنٹ پیج کے ہر ویب میں دو اسٹینڈرڈ فولڈرز Private اور Images ضرور موجود ہوتے ہیں۔ جب سائٹ پبلش ہو جاتی ہے تو ویب براؤزرز Private فولڈر میں موجود پیجز حاصل نہیں کر سکتے۔ یعنی ایسے پیجز جو آپ لوگوں کو دکھانا نہیں چاہتے وہ اس فولڈر میں رکھے جاتے ہیں۔

Images فولڈر میں آپ پورے ویب کی گرافکس رکھ سکتے ہیں۔ ویب پیجز اور گرافکس فائلوں کو مختلف جگہوں پر رکھنے سے آپ زیادہ آسانی کے ساتھ سائٹ کی تنظیم کر سکتے ہیں۔

فولڈرز ویو میں فائلوں کی تنظیم کے سلسلے میں مختلف کام کرنے کے طریقہ کار ذیل میں دیے گئے ہیں۔

☆ کسی فولڈر کے اجزا دیکھنے کے لیے اس فولڈر پر ڈبل کلک کریں۔

☆ کسی فائل کا نام تبدیل کرنے کے لیے ونڈو کے دائیں حصے میں مطلوبہ فائل کے نام پر رائٹ کلک کریں اور ظاہر ہونے والے مینو سے

Rename کی کمانڈ چنیں۔ نیا نام لکھیں اور اینٹر دبا دیں۔ فائل نیا نام اختیار کر لے گی۔

☆ نیا فولڈر بنانے کے لیے فرنٹ پیج کی مینو بار میں موجود File کے مینو سے New چنیں اور اس کے سائیڈ مینو سے Folder کی کمانڈ پر کلک کریں۔ ایک نیا فولڈر دونوں حصوں میں ظاہر ہو جائے گا اور بائیں خانے میں یہ روشن ہوگا۔ اسے اپنی پسند کا نام دیں اور اینٹر دبا دیں۔

☆ کسی پیج کو کسی فولڈر میں ڈالنے کے لیے پیج پر کلک کریں اور اسے ڈریگ کرتے ہوئے مطلوبہ فولڈر کے اوپر لے جا کر رکھیں اور ماؤس کا بٹن چھوڑ دیں۔ پیج نئی جگہ پر منتقل ہو جائے گا۔

☆ دائیں حصے میں فائلوں کی لسٹ کو ترتیب دینے کے لیے اس حصے کے اوپر موجود کسی بھی کالم کے لیبل پر کلک کریں۔ مثال کے طور پر لسٹ کو نام کے لحاظ سے ترتیب دینے کے لیے Name لیبل پر کلک کریں گے۔

☆ کسی فائل کو ڈیلیٹ یعنی ختم کرنے کے لیے مطلوبہ فائل پر کلک کریں اور Delete دبا دیں۔ ایسا کرنے سے Confirm Delete ڈائیلاگ باکس ظاہر ہوگا جو آپ سے ڈیلیٹ کے عمل کی تصدیق چاہے گا۔ ڈیلیٹ کرنے کے لیے Yes پر کلک کر دیں۔

☆ کسی فائل کو کھولنے کے لیے مطلوبہ فائل پر کلک کریں۔ وہ فائل پیج ویو میں (اگر یہ HTML فائل ہے) یا Image Composer میں (اگر یہ گرافک فائل ہے) کھل جائے گی۔

☆ کسی فائل کی خصوصیات یا پراپرٹیز دیکھنے کے لیے مطلوبہ فائل کے نام پر رائٹ کلک کریں اور کھلنے والے مینو سے Properties کی کمانڈ چنیں۔ پراپرٹیز کا ڈائیلاگ باکس ظاہر ہو جائے گا۔

رپورٹس ویو (Reports View)

رپورٹس ویو آپ کو ویب کے اندر پیجز منظم کرنے کی سہولت دیتا ہے۔ ویب سائٹس کے ساتھ کام کرتے ہوئے فرنٹ پیج پراجیکٹ کو ایک ایسی انفرادی اکائی (ویب) سمجھتا ہے جو چھوٹے حصوں (فائلوں) سے مل کر بنتی ہے۔ رپورٹس ویو آپ کو ویب کے اندر موجود فائلوں کے بارے میں وسیع معلومات مہیا کرتا ہے۔ رپورٹس ویو میں آپ ایک ویب میں موجود ہر فائل کے متعلق معلومات کا خلاصہ دیکھ سکتے ہیں۔

☆ Name: فائلوں کی قسمیں مثلاً تصویریں، منسلک فائلیں اور سلو پیجز۔

☆ Count: کسی فائل قسم کی فائلوں کی تعداد۔

☆ Size: فائل کا مکمل سائز جس میں اس کے ساتھ جڑی چیزیں مثلاً تصویروں کا سائز بھی شامل ہوتا ہے۔

☆ Description: یہ آئٹم شمار میں آنے والی تمام فائلوں کی تفصیل مثلاً نام یا ٹائپ بیان کرتی ہے۔ ویب ڈیزائننگ کی عام اصطلاحات میں سائز کو پیج ویٹ (Page Weight) بھی کہا جاتا ہے۔

نیوی گیشن ویو (Navigation View)

نیوی گیشن ویو یہ سہولت دیتا ہے کہ ایک ایسا چارٹ بنا سکیں جس کو استعمال کر کے ناظرین سائٹ کے مختلف پیجز میں گھومیں گے۔ ویو کے اوپری حصے میں نیوی گیشن کا اسٹرکچر بنانے سے آپ نیوی گیشن بار (تحریری ہائپر لنکس یا بٹنوں کی قطاریں جنھیں ناظرین مختلف صفحات میں گھومنے کے لیے استعمال کرتے ہیں) بناتے ہیں۔ نچلے حصے میں فائلوں کی وہی لسٹ موجود ہوتی ہے۔

ہائپر لنکس ویو (Hyperlinks View)

ہائپر لنکس ویو کی مدد سے ویب میں استعمال ہونے والے تمام لنکس کا جائزہ لے سکتے ہیں۔ ٹیمپلیٹس یا وزرڈز کے ذریعے بنائی گئی ویب سائٹس میں ہائپر لنکس ڈیفالٹ کے طور پر شامل ہوتے ہیں جو سائٹ کے پیجز کو ایک دوسرے سے ملاتے ہیں اور بعض اوقات دوسری جانب سائٹس سے۔

ہائپر لنکس ویو کے بائیں حصے میں سائٹ میں موجود تمام فائلوں اور فولڈرز کی فہرست ہوتی ہے جس میں اعلیٰ سطح کا پیج (عام طور پر ہوم پیج) اوپر ہوتا ہے۔ جبکہ دائیں حصے میں اس پیج کے لنکس کا گوشوارہ ہوتا ہے جو بائیں حصے میں منتخب ہوتا ہے۔ اس پیج کے دوسرے پیجز میں لنکس بائیں طرف اور پیج کے اندر موجود دوسرے پیجز کے لنکس دائیں جانب ظاہر ہوتے ہیں۔

فہرست کے حصے میں آپ جس پیج پر کلک کرتے ہیں اس کے لنکس دائیں حصے میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کسی پیج پر بنے چھوٹے سے جمع کے نشان (+) پر کلک کرنے سے اس پیج کے لنکس بھی دکھائی دیتے ہیں اور گوشوارہ مزید پھیل جاتا ہے۔

ٹاسکس ویو (Tasks View)

ٹاسکس ویو میں آپ سائٹ کو مکمل کرنے کے لیے مستقبل میں کرنے والے کاموں کی لسٹ بنا سکتے ہیں۔ یہ ویو اس وقت زیادہ مفید ہوتا ہے جب کسی سائٹ پر ایک سے زیادہ لوگ کام کر رہے ہوں کیونکہ وہ تمام افراد اس لسٹ کا ایک دوسرے سے تبادلہ کر سکتے ہیں۔

فرنٹ پیج ویب میں پیجز ڈالنا

جب آپ کوئی فرنٹ پیج ویب بناتے ہیں (خاص طور پر ایک پیج پر مشتمل ویب) تو یقیناً آپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ بعد میں آپ سائٹ میں پیجز ڈالیں۔ آپ یہ کام پیج ویو استعمال کرتے ہوئے کرتے ہیں۔ اگر ایک یا دو خالی پیج شامل کرنا چاہتے ہیں یا آپ پہلے سے بنے پیج اپنی ویب سائٹ میں امپورٹ کرنا چاہتے ہیں تو ایسا آپ نہایت آسانی سے کر سکتے ہیں۔

نیا ویب پیج بنانا

فرنٹ پیج کو سائٹ میں اضافی پیج ڈالنے کی سہولت دیتا ہے جن میں آپ بعد میں اجزا ڈال سکتے ہیں۔ فرنٹ پیج ویب میں نیا پیج ڈالنے کے لیے بہتر یہ ہے کہ آپ مندرجہ ذیل عمل فولڈرز ویو میں کریں۔

1- فولڈرز ویو میں اپنا ویب کھولیں۔ فرنٹ پیج کی مینو بار میں موجود File کے مینو سے New چنیں اور اس کے سائیڈ مینو سے Page کی کمانڈ پر کلک کریں (یا اسٹینڈرڈ ٹول بار پر موجود New Page کے ٹول پر کلک کریں یا Ctrl+N دبائیں)۔

2- نئے پیج کے لیے فائل کا نام لکھیں۔ فائل کا نام مختصر، واضح اور یاد رکھنے میں آسان ہونا چاہیے اور اس کی ایکس ٹینشن htm. یا html. ہونی چاہیے۔ نام لکھنے کے بعد انٹر دبائیں۔

پہلے سے بنے ویب پیجز امپورٹ کرنا

اگر آپ کسی اور ویب سائٹ سے پیجز اپنی ویب سائٹ میں ڈالنا چاہتے ہیں یا کسی اور پروگرام میں بنی فائل کو بطور پیج شامل کرنا چاہتے ہیں تو آپ آسانی کے ساتھ انھیں امپورٹ کر سکتے ہیں۔ آپ کمپیوٹر، لوکل نیٹ ورک یا ورلڈ وائڈ ویب پر محفوظ فائلوں یا مکمل فولڈرز کو امپورٹ کر سکتے ہیں۔ امپورٹ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کریں۔

1- ٹول بار میں موجود File کے مینو سے Import کی کمانڈ چنیں۔ Import File to Front Page Web ڈائیلاگ باکس کھل جائے گا۔

2- اپنے کمپیوٹر یا لوکل نیٹ ورک پر محفوظ ایک یا زیادہ فائلوں کو امپورٹ کرنے کے لیے Import File to Frontpage Web ڈائیلاگ باکس میں Add File بٹن پر کلک کریں۔ Add File to Import List ڈائیلاگ باکس ظاہر ہوگا۔

3- اپنے کمپیوٹر یا لوکل نیٹ ورک پر محفوظ پورے فولڈر کو امپورٹ کرنے کے لیے Import File to Frontpage Web ڈائیلاگ باکس میں Add Folder بٹن پر کلک کریں۔ Browser For Folder ڈائیلاگ باکس ظاہر ہوگا۔

4- اگر آپ انفرادی فائلوں کو امپورٹ کر رہے ہیں تو Add Files to Import List ڈائیلاگ باکس میں مطلوبہ فائلیں منتخب کریں اور Open پر کلک کر دیں۔ ڈائیلاگ باکس بند ہو جائے گا اور Import File to Frontpage Web ڈائیلاگ باکس میں منتخب شدہ فائلیں امپورٹ لسٹ میں ظاہر ہوں گی۔

5- اگر آپ فولڈر امپورٹ کر رہے ہیں تو Browse for Folder ڈائیلاگ باکس سے مطلوبہ فولڈر چنیں اور OK پر کلک کر دیں۔ ڈائیلاگ باکس بند ہو جائے گا اور مطلوبہ فولڈر میں موجود فائلیں Import File to Frontpage Web ڈائیلاگ باکس میں امپورٹ لسٹ میں ظاہر ہوں گی۔

6- Import File to Frontpage Web ڈائیلاگ باکس OK بٹن پر کلک کریں۔ فرنٹ پیج آپ کی منتخب کردہ فائلوں کو امپورٹ کر دے گا۔ امپورٹ کا عمل مکمل ہوتے ہی ڈائیلاگ باکس بند ہو جائے گا۔

پہلے سے بنا فرنٹ پیج ویب کھولنا

آپ ایک ہی کمپیوٹر پر مختلف ویب سائٹس بنا اور منظم کر سکتے ہیں لیکن آپ ایک وقت میں صرف ایک سائٹ کھول کر اس پر کام کر سکتے ہیں۔ ایک پہلے سے بنے فرنٹ پیج ویب کو کھولنے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کریں۔

1- فرنٹ پیج کی مینو بار میں موجود File کے مینو سے Open Web کی کمانڈ چنیں۔

2- Open Web باکس میں موجود ویب کی لسٹ سے مطلوبہ ویب منتخب کریں اور Open پر کلک کر دیں۔

اگر آپ نے حال ہی میں کسی ویب پر کام کر کے اسے بند کیا ہے تو آپ اسے File کے مینو میں موجود Recent Webs کے سائیڈ مینو میں موجود لسٹ سے منتخب کر کے کھولیں۔

کسی فرنٹ پیج ویب کو ڈیلیٹ کرنا

کسی فرنٹ پیج ویب کو ختم کرنے کا طریقہ کار ذیل میں دیا گیا ہے۔

1- فرنٹ پیج میں مطلوبہ ویب کھولیں اور File کے مینو سے Delete Web کی کمانڈ چنیں۔ Confirm Delete کا ڈائیلاگ باکس ظاہر ہوگا جو آپ کو دو آپشن دے گا۔

2- اگر آپ صرف ویب ڈیلیٹ کرنا چاہتے ہیں اور اس میں شامل فائلیں موجود رکھنا چاہتے ہیں تو Web, Preserving All Other Files And Folders Remove Only Frontpage Information From This کے آگے موجود بٹن پر کلک کریں اور پھر OK بٹن پر کلک کر دیں۔ ڈائیلاگ باکس بند ہو جائے گا اور فرنٹ پیج ان فائلوں کی فرنٹ پیج معلومات کو ختم کر دے گا۔

3- ویب کو مکمل طور پر ہارڈ ڈسک سے ختم کرنے کے لیے Entirely By Deleteing All Of Its Files And Folders کے آگے موجود بٹن پر کلک کریں اور پھر OK پر کلک کر دیں۔

یہ ڈائیلاگ باکس ذیل کی شکل میں دکھایا گیا ہے۔

فرنٹ پیج بند کرنا

فرنٹ پیج بند کرنے کے لیے File کے مینو سے Exit کی کمانڈ چنیں یا Alt+F4 دبائیں۔

محمد اخلاق آزاد — کوئز

علم نباتات (Botany)

(1) مندرجۂ ذیل میں سے کسے بابائے نباتیات کہا جاتا ہے؟
(الف) لیمارک (Lemark)
(ب) تھیوفارسٹس (Theopharstus)
(ج) ارسطو (Aristotle)
(د) ٹریوریٹس (Treviranus)

(2) "Historia Plantarum" کے مصنف مندرجۂ ذیل میں سے کون ہیں؟
(الف) ہپوکریٹس
(ب) کارلینیس (Carlinnaeus)
(ج) تھیوفارسٹس (Theopharstus)
(د) ایشلر (Eichler)

(3) عام طور سے عالم نباتات (Botanical Kingdom) کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟
(الف) تین (ب) دو
(ج) چار (د) پانچ

(4) International Code of Botanical Nomenclature کی بنیاد کب پڑی؟
(الف) 1954 (ب) 1955
(ج) 1957 (د) 1956

(5) مندرجۂ ذیل میں کسے ہندستان کا بابائے نباتیات (Father of Indian Botany) کہا جاتا ہے؟
(الف) ولیم راکس بارگ (ب) اے. کے. شرما
(ج) ایس. آر. کشیپ (د) کے. بی. مہتا

(6) مرکزہ (Nucleus) کی کھوج کس نے کی؟
(الف) رابرٹ ہک (Robert Hook)
(ب) جارج (George)
(ج) رابرٹ براؤن (Robert Brown)
(د) فلیمنگ (Fleming)

(7) الکحل کی صنعت میں اکثر کس سارو غ (Fungi) کا استعمال کیا جاتا ہے؟
(الف) ییسٹ (Yeast) (ب) میوکر (Muker)
(ج) پنی سیلیم (Pennicilliam)
(د) مندرجہ بالا بھی

(8) دوا کس پودے سے بنائی جاتی ہے؟
(الف) اشنیات (Algae) (ب) سارو غ (Fungi)
(ج) جراثیم (Bacteria) (د) وائرس (Virus)

(9) Penicillin (پنی سیلین) کا نام انٹی بایوٹیک (Antibiotic) سب سے پہلے کس شخص نے رکھا تھا؟
(الف) رابرٹ ہک (ب) رابرٹ کک
(ج) رابرٹ (د) فلیمنگ

(10) پھولوں کا مطالعہ کہلاتا ہے؟
(الف) انتھولوجی (Anthology) (ب) پامولوجی (Pomology)
(ج) برایولوجی (Briology) (د) ویرولوجی (Verology)

(11) مندرجۂ ذیل کس پودے میں کبھی پھول یا بیج نہیں بنتا ہے؟
(الف) آرکی ڈس (Archidus)
(ب) جمنوسپرم (Gymnosperm)
(ج) کریٹوگیمس (Crytogames)
(د) انجیو سپرم (Angiosperm)

(12) National Botanical Research Institute کہاں واقع ہے؟
(الف) چینئی (ب) کولکاتہ
(ج) دلّی (د) لکھنؤ

(13) صبح کا نور (Morning Glory) مندرجۂ ذیل میں سے کس پودے کو کہا جاتا ہے؟
(الف) چندن (ب) یوفربیا
(ج) ٹرائیڈکس (د) ایپومیا پر یوریا

(14) سویابین (Soyabin) میں کتنا فیصد پروٹین ہوتا ہے؟
(الف) 60 فیصد (ب) 50 فیصد
(ج) 40 فیصد (د) 80 فیصد

(15) مندرجۂ ذیل کس پھل میں سب سے زیادہ وٹامن پایا جاتا ہے؟
(الف) آم میں (ب) آنولا میں
(ج) لیموں میں (د) سیب میں

(16) کس فصل میں سب سے زیادہ پروٹین پایا جاتا ہے؟
(الف) ارہر میں (ب) مٹر میں
(ج) سویابین میں (د) گیہوں میں

(17) اگر دنیا سے پیڑ پودے ناپید ہو جائیں تو حیوان مر جائے گا کیونکہ؟
(الف) سردی بڑھ جائے گی۔ (ب) غذا کی کمی ہو جائے گی۔
(ج) لکڑی کی کمی ہو جائے گی۔ (د) آکسیجن کی کمی ہو جائے گی۔

(18) رات میں پیڑ پودے کے نیچے نہیں سونا چاہیے کیونکہ:
(الف) رات میں پیڑ پودے آکسیجن گیس چھوڑتے ہیں۔
(ب) رات میں پیڑ پودے کے نیچے کافی گرمی پڑتی ہے۔
(ج) رات میں پیڑ پودے کاربن ڈائی آکسائیڈ (Co2) چھوڑتے ہیں۔
(د) مندرجہ بالا سبھی صحیح ہیں۔

(19) چکوری پاؤڈر (Chickory Powder) جو کافی پاؤڈر کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔ وہ حاصل ہوتا ہے:
(الف) پتی سے (ب) جڑ سے
(ج) تنا سے (د) پھول سے

(20) افلاٹوکسن (Aflatoxin) کیا ہے؟
(الف) فنگی (سمارو غ) سے پیدا زہر
(ب) انٹی بایوٹیک
(ج) سانپ کا زہر (د) وائرس سے پیدا زہر

(21) 1735 میں سب سے پہلے کس شخص نے ربڑ کی کھوج کی؟
(الف) جارج ایڈ بارگ (ب) ایمولوسا نچیز
(ج) چالس کوڈامن (د) موناہی

(22) اخراج بخارات (Transpiration) میں کیا ہوتا ہے:
(الف) پتیوں سے کاربن ڈائی آکسائڈ نکلتی ہے۔
(ب) پتیوں سے پانی بھاپ کی شکل میں نکلتا ہے۔
(ج) پتیوں سے پانی بوند کی شکل میں نکلتا ہے۔
(د) پتیوں سے آکسیجن نکلتی ہے۔

(23) دودھ دہی میں تبدیل ہو جاتا ہے:
(الف) جراثیم کی وجہ سے (ب) سمارو غ کی وجہ سے
(ج) وٹامن کی وجہ سے (د) کیمیائی خمیر کی وجہ سے

(24) Polio Vaccine کی کھوج کس ماہر علم طبعیات نے کی؟
(الف) ریڈ (Reed) (ب) پاپر (Popper)
(ج) پلاز (Platz) (د) اسمتھ (Smith)

(25) آم کس قسم کا پھل ہے؟
(الف) پوم (Pome) (ب) بیری (Berry)
(ج) ڈروپ (Drope) (د) پیپو (Pepo)

(26) نیل کا نباتاتی نام کیا ہے؟
(الف) اکسیا کوپچو (ب) اینڈیگوفیرانٹک ٹوریا
(ج) بیٹولا مونو سپرما (د) مندرجہ بالا میں سے کوئی نہیں

(27) پودے کی نشوونما کے لیے کتنے قسم کے کیمیاوی اجزا کی ضرورت ہوتی ہے؟
(الف) بیس (ب) پچاس
(ج) دس (د) سولہ

(28) پودے کے کس حصے سے اخراج بخارات (Transpiration) سب سے زیادہ ہوتا ہے؟
(الف) تنے سے (ب) پتیوں سے
(ج) اسٹومیٹا سے (د) ان میں سے کسی سے نہیں

(29) مندرجہ ذیل میں کون سا صحیح ہے؟
(الف) بجلی کے چمکنے سے برف گرتی ہے۔
(ب) بجلی کے چمکنے سے مٹی کی زرخیزی بڑھ جاتی ہے۔
(ج) بجلی کے چمکنے سے مٹی کی زرخیزی ختم ہو جاتی ہے۔
(د) مندرجہ بالا کوئی صحیح نہیں ہے۔

(30) Central National Botanical Museum کہاں واقع ہے؟
(الف) دہرادون (ب) چینئی
(ج) شیو پور، کولکاتہ (د) الہ آباد

(31) کلوروفل کی ساخت میں مندرجہ ذیل کس کی ضرورت پڑتی ہے؟
(الف) تانبا و جستہ (ب) کیلشیم و لوہا
(ج) جستہ و بوران (د) لوہا و میگنیشیم

(32) پھلوں کو مندرجہ ذیل کس مصنوعی طریقے سے پکایا جاتا ہے؟
(الف) میتھن (Methene) (ب) اتھیلین (Athelene)
(ج) اسٹیلین (Acetline) (د) سوڈیم کلورائیڈ (NaCl)

(33) پودے میں Etiolation ہوتا ہے جب:
(الف) وہ روشنی میں بڑھتا ہے۔
(ب) وہ اندھیرے میں اگتا ہے۔
(ج) جب کاٹ کاٹ کر اگایا جاتا ہے۔
(د) وہ بغیر پانی کے اگتا ہے۔

(34) تیزابی بارش کی وجہ ہو سکتی ہے؟
(الف) SO_2+NO_2 (ب) CO_2+CO
(ج) CO_2 (د) $CO+N_2O$

(35) سب سے بڑا بیج کس پودے میں پایا جاتا ہے؟
(الف) آم میں (ب) لاڈوسیا میں
(ج) یوکلپٹس میں (د) کٹھل میں

(36) جین (Gene) کا استعمال سب سے پہلے کس نے کیا تھا؟

(الف) مینڈل نے (ب) ارسطو نے
(ج) جوہانسن نے (د) ان میں سے کوئی نہیں

(37) ازولا (Azolla) کا استعمال ہوتا ہے:
(الف) غذا کی شکل میں (ب) کیمیائی کھاد کی شکل میں
(ج) دوا کی شکل میں (د) ان سبھی میں

(38) ہندستان میں کس پودے کی بیماری سے فصل کو زیادہ نقصان پہنچتا ہے؟
(الف) رسٹ (Rust)
(ب) لیٹ بلائیٹ (Late Blight)
(ج) لیف اسپاٹ (د) ٹِکا (Tikka)

(39) رنگ کی بیماری (Ring Disease) کا تعلق کس فصل سے ہے؟
(الف) مٹر (ب) آلو
(ج) لہسن (د) پیاز

(40) مندرجۂ ذیل کس فصل میں سب سے زیادہ کروموسوم (Chromosome) پایا جاتا ہے:
(الف) آلو (ب) گیہوں
(ج) ٹماٹر (د) مٹر

(41) مٹی کی ایک انچ پرت بننے میں کتنے سال لگتے ہیں؟
(الف) 500 سال (ب) 600 سال
(ج) 300 سال (د) 200 سال

(42) جھوم کھیتی (Shifting Cultivation) کہا جاتا ہے:
(الف) جب ایک ساتھ ایک سے زیادہ فصل اگائی جاتی ہے۔
(ب) جب کھیتی سے اچھی آمدنی آتی ہے۔
(ج) جب مٹی کی زرخیزی ختم ہونے پر اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔
(د) مندرجہ بالا سبھی صحیح ہیں۔

(43) ہندستان میں کتنے قسم کے جنگل پائے جاتے ہیں؟
(الف) 10 (ب) 15
(ج) 16 (د) 11

(44) "Hetrotrophic" کہا جاتا ہے؟
(الف) جو اپنی غذا خود بناتا ہے۔
(ب) جو غذا کے لیے دوسرے پر منحصر کرتا ہے۔
(ج) جو غذا کھاتا ہی نہیں ہے۔
(د) مندرجہ بالا کوئی صحیح نہیں ہے۔

(45) کلوروفل کس میں پایا جاتا ہے؟
(الف) نباتات میں (ب) حیوان میں
(ج) خشکی میں (د) مندرجہ بالا سبھی میں

(46) "United Nations Environmental Programme" کا مرکز کہاں ہے؟
(الف) واشنگٹن (ب) دہلی
(ج) نیروبی (د) جنیوا

(47) مندرجۂ ذیل میں سے کس کا استعمال ایندھن کی شکل میں سب سے زیادہ ہوتا ہے؟
(الف) پٹرول کا (ب) کراسن تیل کا
(ج) کوئلے کا (د) لکڑی کا

(48) ہندستانی حکومت نے کب "Environmental Prevention Act" نافذ کیا؟
(الف) 1986 (ب) 1985
(ج) 1983 (د) 1984

(49) کلوروفل (Chlorophyll) A, B کس رنگ کی روشنی کو زیادہ منعکس کرتا ہے؟
(الف) پیلا رنگ (ب) لال رنگ
(ج) ہرا رنگ (د) سفید رنگ

(50) برف پر پائی جانے والی کائی (Algae) کو کیا کہا جاتا ہے؟
(الف) کرپٹوفائٹس (Cryptophytes)
(ب) لیتھوفائٹس (Lethophytes)
(ج) کارا (Chara)
(د) ان میں سے کوئی نہیں

(51) طاقت کا مرکز کہا جاتا ہے؟
(الف) لائسوسوم (Lysosome) (ب) مائٹوکونڈریا
(ج) گولجی باڈی (Golgybody) (د) سیل (Cell)

(52) جسم میں کولیسٹرول (Colestrol) کم کرنے کے لیے مندرجۂ ذیل میں سے کس کا استعمال کیا جاتا ہے؟
(الف) ادرک (ب) لہسن
(ج) میتھی (د) تلسی

(53) آلو کے کس حصے کو کھایا جاتا ہے؟
(الف) تنا (ب) کلی
(ج) جڑ (د) پھل

(54) پھول گوبھی کے کس حصے کو کھایا جاتا ہے؟
(الف) پھل (ب) پتی
(ج) کلی (د) ان میں سے کسی کو نہیں

164, Sabarmati Hostel, JNU, New Delhi-67

□□□

اقبال احمد

کمپیوٹر سینٹر کے فارغ طلبہ کے انٹرویو۔14

بڑھتے قدم

شہانہ کاظمی نے جن کے والد NCDC میں ایک سرکاری ملازم ہیں، ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ اس کے بعد دہلی یونیورسٹی سے گریجویشن مکمل کیا۔ اسی دوران انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت چلائے جارہے ایک سالہ ڈپلوما اِن کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔ کورس کوشش ایجوکیشن سوسائٹی میور وہار، دہلی میں نہ صرف مکمل کیا بلکہ پوری دہلی میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ آج اسی کورس کی بدولت ایک غیرسرکاری ادارے جاگوری دہلی میں کمپیوٹر آپریٹر و سسٹم ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہی ہیں۔ ان کا مختصر انٹرویو قارئین "اردو دنیا" کے لیے پیش ہے۔

سوال: کمپیوٹر سے آپ کو کیسے دلچسپی ہوئی؟

جواب: دراصل جب میں دسویں کلاس کی طالبہ تھی اسی وقت سے مجھے کمپیوٹر کا شوق تھا۔ لیکن کمپیوٹر میں میری دلچسپی اس وقت بڑھی جب میرے دادا جان نے اس جانب میری توجہ مبذول کی۔ وہ کتابت کرتے تھے اور میں نے ان سے کتابت سیکھنے کی درخواست کی تو دادا جان نے کہا کہ بیٹا! آج کمپیوٹر کا زمانہ ہے۔ بہتر ہے کہ تم کمپیوٹر کورس کرلو کیوں کہ کتابت سے زیادہ کمپوزنگ کو لوگ ترجیح دیتے ہیں چنانچہ ان کی رائے کے مطابق میں نے کوشش ایجوکیشن سوسائٹی میں داخلہ لے کر اپنا خواب پورا کیا۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر دوسرے سینٹروں سے کس اعتبار سے مختلف ہیں؟

جواب: میں سمجھتی ہوں کہ دیگر سینٹروں کے مقابلے میں کونسل کے سینٹرز کافی مختلف ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے توسط سے اردو زبان کا فروغ ہورہا ہے۔ اردو سے ناواقف طلبہ کو اردو سکھا کر ان سے اردو پیکج میں کام کرایا جارہا ہے یہ کیا کم ہے؟

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹروں میں جو تربیت دی جارہی ہے، اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب: میں سو فیصد مطمئن ہوں۔ طریقۂ تعلیم بہت اچھا ہے، اساتذہ بہت ہی محنت و لگن سے پڑھاتے ہیں۔

سوال: قومی اردو کونسل کے کمپیوٹر سینٹر اُردو داں طبقے کو روزگار فراہم کرانے میں کس حد تک معاون ہیں؟

جواب: ویسے تو ہر انسان کو منزلِ مقصود پانے کے لیے محنت اور کوشش اولین شرط ہے۔ لیکن کونسل کے سینٹرز منزل تک پہنچانے کا اہم ذریعہ ہیں۔ اور اردو داں طبقے کے لیے خوش آئند بھی۔ جس کی مثال میں خود ہوں۔

سوال: انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا کا حصہ بن کر آپ کو کیسا لگ رہا ہے؟

جواب: مجھے لگ رہا ہے کہ اس وسیع وعریض کائنات میں پھیلی ہوئی دنیا کو بہت قریب سے دیکھ رہی ہوں اور میں دنیا کی رفتار کے ساتھ شانہ بہ شانہ چل رہی ہوں۔

سوال: اس میدان میں آنے کے بعد کیا آپ میں کوئی بدلاؤ آیا ہے؟ کیا آپ کی خوداعتمادی اور خودانحصاری میں اضافہ ہوا ہے؟

جواب: یقیناً میرے اندر زبردست تبدیلی آئی ہے۔ ناامیدی جاتی رہی، بے اعتمادی خوداعتمادی میں تبدیل ہوگئی اور اتنی شادمانی ہورہی ہے کہ پراعتمادی کی فضا میں رہ کر سکون سے سروس کررہی ہوں۔

سوال: آپ لازمی طور پر ملٹی لنگول ہیں۔ یہ آپ کے لیے ایک بے حد مثبت چیز ہے۔ آپ اپنی اس خصوصیت کی بنا پر مارکیٹ میں اپنے آپ کو کس مقام پر پاتی ہیں؟

جواب: یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے کہ ہم ملٹی لنگول کہے جاتے ہیں اور یہ قومی کونسل کی ہی دین ہے، مجھے بے انتہا خوشی ہورہی ہے۔ اس خصوصیت سے یقیناً ہم مارکیٹ میں دوسروں سے ممتاز ہیں۔

سوال: آپ نے کمپیوٹر سینٹر میں جو فیس ادا کی، وہ آپ کے لیے بوجھ تو نہیں تھی؟

جواب: بالکل نہیں، کورس کے حساب سے فیس کوئی زیادہ نہیں ہے۔

□□□

اردو خبرنامہ

قومی اردو کونسل کے 107 اردو اسٹڈی سینٹر ملک بھر میں قائم

● نئی دہلی، 20 جولائی۔ قومی اردو کونسل اردو زبان اور اردو رسم خط کو مقبولِ عام کرنے کی کوششوں میں ہمہ وقت مصروف ہے۔ اس سلسلے میں کونسل نے ملک بھر میں اردو سکھانے کے لیے 107 اردو اسٹڈی سینٹر قائم کیے ہیں جن میں 15 ہزار افراد نے داخلہ لیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اردو سیکھنے والوں کی اس طویل فہرست میں ہر پیشے، عمر، علاقے اور مذہب کے لوگ شامل ہیں۔

اس سلسلے میں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے اردو گھر، انجمن ترقی اردو (ہند) میں کونسل کی طرف سے چلائے جانے والے ایک سالہ ڈپلوما کورس ان اردو لینگویج کے اسٹڈی سینٹر کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ''اردو سیکھنے کا جو نیا رجحان اور نیا شعور بیدار ہوا ہے وہ ملک کے مشترکہ کلچر کو مزید مضبوطی عطا کرے گا۔'' انھوں نے مزید کہا کہ زبانیں کسی مخصوص مذہب یا فرقے کی نہیں، ہم سب کی مشترکہ میراث ہیں۔ جس طرح اجنتا، ایلورا اور تاج محل ہماری مشترکہ میراث ہیں اسی طرح ہندستان کے مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبانیں بھی ہندستان کی سنسکرتی کا اٹوٹ حصہ اور ہماری مشترکہ وراثت ہیں۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ اردو کی طرف عوامی رجحان میں اضافہ ہوا ہے اور اب بڑی تعداد میں غیر مسلم حضرات بھی اردو سیکھ رہے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے اردو اسٹڈی سینٹر میں 200 افراد نے داخلے لیے ہیں جن میں ایک بڑی تعداد سپریم کورٹ کے وکیلوں، سرکاری افسران اور دیگر شائقین اردو کی ہے۔ یہی حال کونسل کے دیگر اردو اسٹڈی سینٹروں کا ہے جن میں کثیر تعداد میں لوگوں نے اردو سیکھنے کے لیے داخلے لیے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ نے امید ظاہر کی کہ آنے والے دنوں میں اردو زبان کو مزید فروغ حاصل ہوگا اور اس کی مقبولیت بڑھتی جائے گی۔ اس طرح ملک کی یہ سب سے بڑی لنگوافرینکا مشترکہ ہندستانی تہذیب کے فروغ میں زیادہ اہم رول ادا کرے گی۔

انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر خلیق انجم نے اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے حقوق کی بازیابی کے لیے انجمن ہر محاذ پر لڑتی رہی ہے، اب اردو سکھانے اور اردو رسم خط کو مقبول بنانے کی کوشش بھی انجمن نے شروع کی ہے اور یہ کورس شروع کرنے کے لیے کونسل مبارکباد کی مستحق ہے۔ انجمن کے سہ ماہی رسالے ''اردو ادب'' کے مدیر ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ اردو کا فروغ دراصل اردو کلچر کا فروغ ہے جیسے جیسے یہ زبان مقبول ہوگی اردو کلچر بھی مقبولِ خاص و عام ہوگا۔ اس موقعے پر طلبہ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔

● لکھنؤ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے اکادمی آف ماس کمیونکیشن، قیصر باغ، لکھنؤ میں اردو اسٹڈی سینٹر کا افتتاح مولانا کلب صادق کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہیے کہ اردو کسی ایک قوم یا ایک مذہب کی زبان ہے۔ یہ مسلمانوں کی نہیں بلکہ تمام ہندستانیوں کی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی تعداد میں غیر مسلم حضرات بھی اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کی بے عملی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ زبان کے بارے میں حکومتوں پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں لیکن اپنی خامیوں پر توجہ نہیں دیتے، حالاں کہ اردو کے زوال کے اسباب خود ہمارے پیدا کردہ ہیں۔ ہم خود اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دینے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ حکومت نے اردو کی تعلیم کے لیے جن اساتذہ کی تقرریاں اسکولوں میں کی ہیں وہ اپنے فرائض پورے نہیں کرتے۔ ہمیں اردو زبان کی بقا اور اس کے تحفظ کے لیے عملی کوششیں کرنی ہوں گی۔

قومی اردو کونسل کا 'اردو آن لائن' پروگرام

● نئی دہلی، 30 جولائی۔ قومی اردو کونسل نے سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کے اشتراک سے اردو سکھانے کے لیے آن لائن پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اردو کی طرف بڑھتے رجحان کے مدِ نظر کونسل نے سی آئی آئی ایل میسور کے ڈائرکٹر کی صدارت میں منعقدہ ڈسٹنس ایجوکیشن کمیٹی کی میٹنگ میں یہ فیصلہ کیا جس میں کشمیر یونیورسٹی، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی اور نیشنل اوپن اسکول کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اس موقعے پر اردو زبان سکھانے کا آن لائن پروگرام شروع کرنے کے لیے سی آئی آئی ایل میسور کے آن لائن پروگرام کا جائزہ لینے کے ساتھ اردو سافٹ ویئر کے ماہرین کا تعاون حاصل کرنے کی تجویز بھی پیش کی۔

اس اہم میٹنگ میں کونسل کی طرف سے چلائے جا رہے ایک سالہ اردو ڈپلوما کورس کی مقبولیت کے پیشِ نظر اسے تین حصوں میں تقسیم کرنے پر بھی غور کیا گیا۔ شرکا کا خیال تھا کہ اس کورس کے تحت اردو رسم خط اور تلفظ سے آشنائی کے لیے اردو سرٹیفکیٹ کورس، شروع کیا جائے جس کی مدت چھ ماہ ہو اور سرٹیفکیٹ کورس مکمل کرنے والے طلبہ یا اردو لکھنا اور پڑھنا جاننے والے افراد کو ایک سالہ اردو ڈپلوما کورس میں داخلہ دیا جائے اور اس کورس کے کامیاب طلبہ کی پروفیشنل ضروریات کی تکمیل کے لیے ایڈوانس ڈپلوما کورس ان اردو لینگویج بھی شروع کیا جائے۔

میڈیا میں اردو کی بڑھتی مقبولیت کے مدِ نظر میٹنگ میں اردو میں جرنلزم کا کورس کرنے والے طلبہ کے لیے اگنو کی تیار کردہ کتابوں کا ترجمہ کرانے کا بھی مشورہ سامنے آیا اور امید ہے کہ اس پر جلد ہی عمل درآمد کیا جائے گا۔

سینٹر انچارج محسن خاں نے ادارے کی کارکردگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ قومی اردو کونسل کی جانب سے پورے ملک میں کمپیوٹر سینٹر اور اردو اسٹڈی سینٹر قائم کیے گئے ہیں جن کے وسیلے سے بہت بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات مستفید ہو کر روزگار حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اکادمی آف ماس کمیونکیشن کے زیر انتظام جو اردو اسٹڈی سینٹر قائم کیا گیا ہے اس میں بڑی تعداد میں غیر مسلم طالب علموں نے بھی داخلہ لیا ہے۔

اس موقعے پر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں، جناب انیس اعظمی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر محمد کاظم، جناب حسین امین، جناب شکیل صدیقی اور سینٹر کے اسٹاف ممبران اور طلبہ وطالبات موجود تھے۔

(ڈاک سے)

کونسل کی طرف سے فروغِ اردو کی دیگر بامعنی کوششیں بھی جاری ہیں اور اس سلسلے میں گزشتہ دنوں پروفیسر ہدایت کول کی صدارت میں ایک ورک شاپ کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ڈاکٹر نذیر حسن، ڈاکٹر کے پلیں مصطفےٰ، فیاض عالم، راجیش کمار سمن، سید غالب، عصمت جہاں اور ظفر انصاری ظفر نے شرکت کی۔ اس ورکشاپ میں اردو ڈپلوما کورس کی درسی کتاب "ابتدائی اردو" اور "آسان اردو شاعری" کو حتمی شکل دی گئی۔

ودیں اثنا اردو ہندی مختصر لغت کی تیاری کے لیے بھی 9 روزہ ورکشاپ منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر مجیب رضوی (صدر)، ڈاکٹر غضنفر علی (پرنسپل اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ) ڈاکٹر گووند پرساد (سینٹر فار انڈین لینگوئجیز جے۔این۔یو)، ڈاکٹر مظہر الحق، جناب عبدالرشید، جناب خان شاہد وہاب اور فرح شاہد نے 10 سے 12 ہزار الفاظ پر مشتمل اس ڈکشنری کے الفاظ منتخب کیے۔

کونسل نے معیاری لغات کی تیاری پر خصوصی توجہ دی ہے۔ جس کے نتائج بھی تشفی بخش رہے ہیں۔ کونسل اب تک فرہنگِ آصفیہ، نوراللغات، مختصر اردو لغت، جامع انگریزی اردو لغت (چھ جلدوں میں) اور مختلف مضامین کی فرہنگیں شائع کر چکی ہے جنھیں ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔

"اقبال کے لسانی تصورات اور زبان"
اقبال اکادمی، حیدرآباد کا سمینار

● حیدرآباد۔ "اردو زبان اور فلسفۂ زبان پر اقبال غیر معمولی بصیرت کے حامل تھے، ان کے نزدیک زبان احساسِ زندگی کی معنویت کا اظہار ہے۔ اقبال نے اپنی شعری زبان کو اس بلند مقام تک پہنچا دیا کہ دہلی اور لکھنؤ کے دبستان حیرت زدہ ہیں۔" ان خیالات کا اظہار اردو اسکالرز نے "اقبال کے لسانی تصورات اور زبان" کے موضوع پر منعقدہ سمینار میں کیا جس کا انعقاد اقبال اکادمی، حیدرآباد کے زیر اہتمام ادارہ ادبیات اردو' ایوان اردو' پنجہ گٹہ، حیدرآباد میں عمل میں آیا۔ اس سمینار میں پروفیسر عبدالستار دلوی سابق صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب سابق استاد انڈولوجی، لندن یونیورسٹی نے مقالے پیش کیے۔ پروفیسر مغنی تبسم سابق صدر شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی نے صدارت کی۔ جناب ضیاء الدین نیر معتمد اقبال اکادمی نے خیر مقدم کیا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی نے اقبال کے نظریۂ زبان پر اپنے مقالے میں کہا کہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں اردو جو ہندستان کی سب سے مقبول اور رابطۂ عامہ کی زبان تھی، لسانی تعصب کے بوجھ تلے دبائی جارہی تھی، اردو، ہندی کی اس جنگ میں جہاں تنگ نظری کارفرما تھی وہیں اس کے پس پشت انگریزی سامراج کا ذہن بھی کارفرما تھا۔ اقبال اتحادِ وطن کی خاطر ہی نہیں بلکہ تمام لسانی ادراک اور شعور کے ساتھ اردو ہندی کے اس مناقشے کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں کی ترقی کے خواہاں تھے۔ ہندستانی پرچار سبھا نے اس نے ان کے اعزاز میں اردو اور ہندی دونوں میں سپاس نامہ پیش کیا۔ اس موقعے پر اقبال نے کہا تھا کہ زبان احساسِ زندگی کی معنویت کی مظہر ہے، جس زبان میں نئے خیالات کو اپنے اندر جذب کرنے کی قدرت ہے، وہی زبان زندہ رہے گی جس کو بولنے والی قوم ایسے افراد کو پیدا کرتی ہے جو نئے خیالات کو پیش کرتے ہیں اور ان نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئے نئے طریقے زبان میں مروج کرتے ہیں۔ علامہ اقبال اردو میں عربی کے غیر مانوس الفاظ اور ہندی میں سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ شامل کرنے کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سیدھی سادی زبان لکھنی چاہیے اور الفاظ وتراکیب کے اختیار کرنے میں تنگ دلی سے کام لینا نہیں چاہیے۔

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین احمد شکیب نے اقبال کی شعری زبان کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کی مادری زبان پنجابی تھی۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری اور اظہار خیال کے لیے اردو، فارسی اور انگریزی کا انتخاب کیا۔ یہ تینوں زبانیں ان کے لیے اکتسابی تھیں، اردو اور فارسی میں انھوں نے اپنی تخلیقی شخصیت کا اظہار کیا اور انگریزی میں اپنے فلسفیانہ خیالات کا۔

اقبال کی شعری زبان کے ارتقا کے بارے میں ڈاکٹر شکیب نے کہا کہ اگرچہ اس میں ابتداً پنجابی زبان اور تہذیب کا اثر رہا لیکن بہت جلد ان کی تخلیقی زبان کتب دہلی سے ہمکنار ہو گئی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ فارسی میں بھی لکھتے رہے اور مرزا غالب کے فارسی آمیز اسلوب کی اتباع بھی کرتے رہے۔ تاہم بہت جلد انھوں نے زبانِ لکھنؤ کے حسن کو پہچان لیا اور اس کے گہرے مطالعے اور پھر اس کی اتباع میں لگ گئے۔ پروفیسر مغنی تبسم سابق صدر شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ اقبال نہ صرف خیالات کے اعتبار سے بلکہ زبان کے لحاظ سے بھی اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں، انھوں نے اردو کو نئی بلندیوں سے روشناس کروایا۔ جناب محمد ظہیر الدین نائب صدر اقبال اکادمی کے شکریے پر جلسے کا اختتام عمل میں آیا۔

(ڈاک سے)

علامہ اقبال پر خصوصی لیکچر

● الٰہ آباد، 11 رجولائی۔ علامہ اقبال اکادمی، الٰہ آباد کی جانب سے ایک لیکچر کا انعقاد جناب محمد علی کاظمی کے مکان پر کیا گیا جس میں اردو کے ممتاز ادیب و ناقد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے علامہ اقبال پر خطبہ پیش کیا۔ جلسے کی صدارت پروفیسر عبدالقادر جعفری (صدر شعبۂ عربی، فارسی الٰہ آباد یونیورسٹی) نے کی اور نظامت محمد علی کاظمی نے کی۔ ابتدا میں اکادمی کے صدر پروفیسر علی احمد فاطمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور ڈاکٹر ضمیر احسن نے اقبال کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

اقبال پر اپنا خصوصی خطبہ پیش کرتے ہوئے جناب فاروقی نے کہا کہ اقبال دنیائے ادب کا واحد شاعر ہے جس نے پانچ ادبی تہذیبوں کو جوڑتے ہوئے اپنی شاعری کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال کو کسی ملک، فرقے، مذہب یا کسی مخصوص فکر و فلسفے کے حوالے سے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ انھیں صرف ایک شاعر کی حیثیت سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ فارسی، عربی، انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں اقبال جیسا شاعر نہیں ہے، کیونکہ یہ وہ شاعر ہے جو ایک لمحے میں زمین و آسمان کو ایک کر دیتا ہے۔ کائنات کی وحدت صرف اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ علامہ اقبال کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے فاروقی صاحب نے کہا کہ مکمل روانی صرف تین شاعروں کے یہاں ملے گی میر، میر انیس اور اقبال۔ اقبال سے زیادہ خوش آہنگ شاعر کوئی نہیں ہے۔ صرف جگانے جھنجھوڑنے کی بات کرنا اقبال کی شاعری کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔

ممتاز ناقد پروفیسر عقیل رضوی نے کہا کہ اقبال کے یہاں مارکسی روایت بھی ملتی ہے۔ جہاں تک انقلاب کی بات ہے تو اقبال کے یہاں یہ تصور سب سے پہلے 20-1918 کے زمانے میں آیا۔ اقبال کی شاعری محسوسات کی شاعری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقبال فکر کی منزل میں غالب سے آگے نکل جاتے ہیں۔ اس میں غالب کا دخل کم دور کا زیادہ ہے کیوں کہ دونوں کا تعلق دو ادوار سے ہے۔ پروفیسر عبدالقادر جعفری نے کہا کہ اقبال انسانیت کے شاعر تھے۔

جلسے میں شرکت کرنے والوں میں کامریڈ ضیاء الحق، پروفیسر او پی مالویہ، ایم اے قدیر، ڈاکٹر فخر الکریم، شاہ محمود احمد رمز، تحسین عثمانی، افضل جائسی، سریندر راہی، بھانشو رنجن، ڈاکٹر طاہرہ پروین، ڈاکٹر نغمہ پروین، جاوید نظر، ڈاکٹر احمد طارق، کہکشاں عرفان، سبطِ حسن، عبدالقیوم شمسی اور ممتاز انور وغیرہ تھے۔

(ڈاک سے)

''تحریر پریم چند کی'' دوردرشن پر

● نئی دہلی۔ ممتاز فلم ساز اور شاعر جناب گلزار نے پریم چند کی نمائندہ تحریروں پر مبنی سیریل تیار کیا ہے جسے 8 راگست سے دکھایا جا رہا ہے۔ پریم چند کے دو مشہور ناولوں ''گئودان' اور'' نرملا'' پر دوردرشن کے لیے گلزار صاحب نے دو طویل فلمیں بنائی ہیں۔ ساڑھے چار گھنٹے کی ''گئودان'' کو دو حصوں میں نشر کیا جائے گا۔ اس میں صرف ہوری اور دھنیا کے کردار کو لیا گیا ہے۔ فلم میں پنکج کپور اور سُریکھا سیکری نے ہوری اور دھنیا کے کردار نبھائے ہیں۔ ''نرملا'' ڈھائی گھنٹے کی فلم ہے جس میں مقبول مراٹھی اداکارہ امرتا سبھاش نے نرملا کا رول ادا کیا ہے۔ ''تحریر: منشی پریم چند کی'' میں 6 دیگر کہانیوں کو بھی شامل کیا گیا ہے جن پر 12 ایپی سوڈ بنائے گئے ہیں۔

دوردرشن پر نشریے کا پروگرام حسب ذیل ہے۔ گئودان 8 راگست کو رات 9 بجے اور 9 اگست کو رات دس بجے۔ گلزار نے پریم چند کی جن کہانیوں پر پروگرام تیار کیے ہیں ان میں جیوتی (نشریے کی تاریخ 29 اگست رات 9 بجے)، سوا سیر گیہوں (نشریے کی تاریخ 5 ستمبر، رات 9 بجے) (15 اگست رات 9 بجے)، کفن (نشریے کی تاریخ 22 اگست رات 9 بجے)، نمک کا داروغہ (نشریے کی تاریخ 12 ستمبر رات 9 بجے)، ٹھاکر کا کنواں (نشریے کی تاریخ 19 ستمبر رات 9 بجے)، پوس کی رات (نشریے کی تاریخ 26 ستمبر رات 9 بجے)، عج اکبر (نشریے کی تاریخ 3 اکتوبر رات 9 بجے)، بوڑھی کاکی (نشریے کی تاریخ 10 اکتوبر رات 9 بجے) شامل ہیں۔ نرملا کے نشر کیے جانے کی تاریخ تین قسطوں میں طے کی گئی ہے۔

(ہندستان، دہلی)

جگر مرادآبادی پر سیریل

● رام پور، 8 رجولائی۔ آل انڈیا ریڈیو رام پور مشہور شاعر جگر مرادآبادی کی زندگی کے اہم پہلوؤں پر مبنی ایک سیریل ستمبر سے نومبر تک نشر کرے گا۔ مشہور ڈرامہ نگار اور تاریخ روہیل کھنڈ کے مصنف نفیس صدیقی نے جگر مرادآبادی پر یہ سیریل تحریر کیا ہے۔ نفیس صدیقی کے مطابق جگر مرادآبادی پر نشر ہونے والے اس سیریل میں کسی ایسے کردار کو جگہ نہیں دی گئی ہے جو خیالی ہو۔ بلکہ تمام ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے جو نہ صرف حقیقت پر مبنی ہیں بلکہ ابھی تک انھیں کہیں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا سالانہ جلسہ

● میدک، 12 رجولائی۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کا 28 واں سالانہ دو روزہ اجتماع 26، 27 رجون کو مدینہ فنکشن ہال، سدی پیٹ میں منعقد کیا گیا۔ اس بار ضلع میدک کے تعلقہ سدی پیٹ کو اردو والوں کے اس اہم اجتماع کے لیے منتخب کیا گیا، کیونکہ سدی پیٹ اردو داں طبقے کی آبادی کے لحاظ سے بے حد اہم ہے۔ مجلسِ صدارت میں جناب محمد شمس الدین اعظمی ایڈووکیٹ، جناب کے ایل مہندر، جناب محمد خلیل الرحمٰن سابق ایم پی، جناب رائے منوہر راج سکسینہ، جناب

غلام یزدانی، جناب خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، جناب نصرت محی الدین شریک معتمد اور جناب سید مسکین احمد کنوینر شامل تھے۔ جناب محمد عبدالرحیم خاں معتمدِ عمومی نے اجلاس کی نظامت کی۔

جلسۂ عام کی صدارت رائے منوہر راج سکسینہ نے کی جب کہ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر خلیق انجم، جناب سلطان احمد، جناب سید مسکین احمد، جناب نصرت محی الدین، جناب ایم اے حکیم موجود تھے۔ نظامت کے فرائض محمد عبدالرحیم خاں نے انجام دیے۔ جناب غلام یزدانی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو تحریک کو نہ صرف رسمی تعلیم کے اداروں سے مربوط کرنا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے بلکہ غیر رسمی نظامِ تعلیم سے بھی وسیع پیمانے پر استفادہ کرنا بہت ضروری ہے۔

جلسے میں جناب محمد خلیل الرحمٰن، رکن عاملہ انجمن ترقی اردو، آندھرا پردیش جناب ایم اے حکیم، صدر انجمن ترقی اردو سنگاریڈی اور ڈاکٹر خلیق انجم نے اظہار خیال کیا۔ آخر میں جناب رائے منوہر راج سکسینہ نے دستور کی مختلف دفعات کی تشریح کرتے ہوئے ملک میں اردو کا قانونی موقف واضح کیا اور کہا کہ 1956 میں لسانی بنیادوں پر ریاست کی تشکیلِ جدید عمل میں آئی۔ آندھرا اور تلنگانہ کے قائدین کے درمیان معاہدہ طے پایا مگر آج تک اس پر سنجیدگی سے عمل نہیں کیا جاسکا۔

27 رجون کو ''اردو تعلیم کے مسائل اور ان کا حل'' کے زیرِ عنوان مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس میں مختلف اسکالرز نے اپنے مقالے پیش کیے۔

(سیاست، حیدرآباد)

انجمن ترقی اردو (گوالیار) کا اردو سکھانے کا سمر کیمپ

● گوالیار۔ انجمن ترقی اردو شاخ گوالیار کے زیرِ اہتمام موسمِ گرما کی تعطیلات میں 17 رمئی سے 17 رجولائی تک اردو سکھانے کا اردو Summer کورس پروگرام شنکر گندھرو میوزک کالج میں چلایا گیا۔ اس پروگرام کے تحت 54 امیدواروں نے اردو سیکھی، جس میں ہر عمر اور ہر طبقے کے افراد شامل تھے۔ ان میں بہت سے امیدوار ایسے تھے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اردو کے ان شیدائیوں میں ریٹائرڈ پرنسپل ڈاکٹر پریم بہادر تیواری، محکمۂ پی ایچ ای میں ملازم رام لعل ساہو، سنگیتا باتھم، سونل اگروال، منیش لیپے، منیش ستیجا، آکاش اور پرکاش جادون نے اردو سیکھنے میں بڑی دلچسپی اور ذوق وشوق کا مظاہرہ کیا۔

دو ماہ کی مختصر مدت میں حروف شناسی سے لے کر حروف ملا کر الفاظ، بنانا، انھیں پڑھنا اور لکھنا، الفاظ اور محاوروں کے معنی سمجھنا اور جملے بنانا، عبارت پڑھنا اور لکھنا، سوالات کے جوابات لکھنا، کلمہ، جملہ، اسم اور فعل کی تعریف اور پہچان، غزل کے بارے میں مختصر معلومات، درخواست، خط اور مختصر مضمون لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا اور آخر میں مندرجہ بالا کورس پر مشتمل پرچہ حل کرنا وغیرہ سکھائے گئے۔

سمر کورس پروگرام کا اختتامی جلسہ 18 رجولائی کو ریذیڈنٹ اسکول ہال میں منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر انجمن کے سکریٹری سہیل احمد قریشی نے اس پروگرام کی رپورٹ پیش کی۔ انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کے ریاستی سکریٹری وقار صدیقی نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ شہر کے مختلف علاقوں میں اردو سیکھنے کے مرکز قائم کیے جائیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ زبان کو صرف روزگار سے جوڑ کر نہیں دیکھنا چاہیے۔ انھوں نے پرائمری اسکولوں میں اردو پڑھانے کے لیے بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن، مدھیہ پردیش سے اردو مضمون کے ساتھ ہائر سیکنڈری پاس شدہ امیدواروں کا تقرر اردو کی اسامیوں پر کرنے کا مطالبہ کیا تاکہ بچوں کو ماہر اساتذہ کے ذریعے اچھی تعلیم دی جاسکے۔

مہمانِ خصوصی آل انڈیا ریڈیو، گوالیار کی ڈائرکٹر محترمہ پربھا سولنکی نے اردو سیکھنے اور سکھانے والوں کی محنت اور لگن کی تعریف کی اور اردو سیکھنے والے امیدواروں کو انجمن کی جانب سے سرٹیفکیٹ بھی تقسیم کیے۔ اس پروگرام میں درج ذیل پانچ امیدواروں نے نمایاں حیثیت حاصل کی۔ یاسمین عرف صبوحی، محمد عارف، انیسہ خان، فرحت شمیم اور عمرین۔

جلسے کی صدارت صدر انجمن اور شیواجی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ونود پرکاش سکسینہ نے کی۔ انھوں نے کہا کہ جس طرح راجستھان میں محکمۂ پولیس کے ملازمین کے لیے اردو سیکھنا ضروری کردیا گیا ہے، ہمیں مدھیہ پردیش میں بھی یہ کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح اردو سیکھنے والوں کا دائرہ وسیع ہوگا اور زبان کو فروغ حاصل ہوگا۔ مقامی شاخ کے جنرل سکریٹری پروفیسر عبدالجلیل قریشی نے حاضرینِ جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

''اردو زبان کے فروغ میں اردو ڈرامے کا حصہ'' سمینار

● لکھنؤ۔ ''اردو تو وہ زبان ہے جس میں ڈرامے کی ترقی ہندی سے پہلے ہوئی۔ ڈرامے کا بنیادی مقصد لوگوں میں سماجی شعور پیدا کرنا ہوتا ہے۔'' اس خیال کا اظہار جناب کے این کلکونے اکادمی آف ماس کمیونیکیشن کی طرف سے منعقدہ سمینار بعنوان ''اردو کے فروغ میں اردو ڈرامے کا حصہ'' میں کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے اردو ڈرامے کی روایت اور زبان کے فروغ میں اس کے رول پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ڈرامہ زبان اور رنگ منچ دونوں کی ترقی میں معاون ثابت ہوتا ہے، خصوصاً جب اسے اسٹیج کیا جائے۔ ڈراما نگار انیس اعظمی نے ڈرامے کی روایت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اپٹا، پرتھوی تھیٹرز، حبیب تنویر کا نیا تھیٹر اور رنجیت کپور وغیرہ کی ڈرامہ انجمنوں نے ڈرامے اور زبان کے فروغ میں اہم رول ادا کیا۔

ڈاکٹر محمد کاظم (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی) نے کہا کہ ڈرامہ لکھنا اور ناٹک اسٹیج کرنا دو مختلف پہلو ہیں، ڈرامے کی اصل پرکھ اس کے اسٹیج کیے جانے سے ہوتی ہے۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے ڈاکٹر شاہد حسین نے ڈرامے کی تکنیک اور کلا کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو ڈرامے کی ایک تابناک تاریخ رہی ہے اور اگر ڈرامے میں دلچسپی رکھنے والے افراد کوشش کریں تو اردو ڈرامے کی تجدید ہوسکتی ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ڈراما عوامی فن ہے اس لیے حکمرانوں نے اس کے ساتھ ہمیشہ سوتیلا رویہ اختیار کیا اور اسے خاطر خواہ سرپرستی نہیں ملی۔ پھر بھی اردو ڈرامہ حالات کا مقابلہ کرتا ہوا ترقی کرتا رہا۔ اگر ہمیں اردو کو زندہ رکھنا ہے تو ڈرامے کو بھی زندہ رکھنا ہوگا۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ اردو زبان و ادب کی اردو ڈرامے نے قابلِ ذکر خدمت کی ہے، ڈرامے اور زبان کی ترقی کے لیے اسے اسٹیج اور عوام سے جوڑنا ہوگا۔ صدر شعبۂ اردو لکھنؤ یونیورسٹی ڈاکٹر انیس اشفاق نے اس موقعے پر ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب کی دو کتابوں ''اودھ کا شاہی اسٹیج'' اور ''اودھ کا عوامی اسٹیج'' کے حوالے سے کئی اہم باتیں کہیں۔ انھوں نے اردو مثنوی اور مرثیہ میں موجود ڈرامائی عناصر پر بھی روشنی ڈالی۔ صدر جلسہ ڈراما ڈائرکٹر جناب سوریہ موہن کل سریشٹھ نے بھی اظہار خیال کیا۔ نظامت شکیل صدیقی نے کی۔

جناب محسن خاں نے سمینار کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی اور اکادمی آف ماس کمیونکیشن کی سرگرمیوں سے مہمانوں کو روشناس کرایا۔ اس موقعے پر مشہور افسانہ نگار بشیشر پردیپ، ڈاکٹر صابرہ حبیب، مشہور ڈراما آرٹسٹ مردولا بھاردواج، ڈرامے سے دلچسپی رکھنے والے افراد کے علاوہ بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات موجود تھے۔ سمینار کے اختتام پر ڈاکٹر اشفاق محمد خاں (ڈائرکٹر اکادمی آف ماس کمیونکیشن) نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

ڈراما ورکشاپ

● ممبئی: ''ایکٹ' ممبئی کا ایک فعال ڈرامہ گروپ ہے جو گزشتہ کئی برسوں سے ممبئی کے قرب و جوار میں پابندی سے ہر ماہ ڈراموں کا ورکشاپ اور شوز منعقد کرتا ہے۔ یہ ورکشاپ مشہور ڈرامہ نویس ہدایت کار مجیب خاں کی نگرانی میں کیے جاتے ہیں۔ ابھی حال ہی میں ایکٹ کا ڈرامہ ''بلقیس بانو'' کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ڈرامے کی تعلیم اردو اور ہندی میں دی جاتی ہے اور ڈرامے سے متعلق تمام باریکیاں سکھائی جاتی ہیں جیسے آواز کا اُتار چڑھاؤ، تلفظ، حرکات و سکنات اور اسٹیج کی چال ڈھال پر خصوصی دھیان دیا جاتا ہے۔ ایکٹ اب دوسرے شہروں میں بھی ورکشاپ منعقد کر رہا ہے۔ ڈراموں سے دلچسپی رکھنے والے اسکول، کالج، ادارے، غیر سرکاری انجمنیں، ''ایکٹ'' کی اس پیش کش کا فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ ورکشاپ کے لیے مجیب خاں بہ نفسِ نفیس خود تشریف لائیں گے۔ ورکشاپ کے انعقاد کے لیے email actmumbai 1983 @ yahoo.com یا اس پتے پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

مجیب خاں (صدر ایکٹ) 492، پہلی منزل سر جے جے روڈ
بمقابل جے جے اسپتال، ممبئی-400008 (ڈاک سے)

اردو اساتذہ کا اورینٹیشن کورس

● نئی دہلی، 3 اگست۔ اردو اکادمی دہلی کے اشتراک سے اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ کی جانب سے غالب اکادمی دہلی میں دہلی کے اردو اساتذہ کے لیے دس روزہ اورینٹیشن کورس کا افتتاح ہوا۔ مہمانِ خصوصی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن نے کورس کا افتتاح کرتے ہوئے کہ معاشرے میں اساتذہ کا اپنے مضمون کے اعتبار سے اپ ٹو ڈیٹ رہنا ضروری ہے کیوں کہ کسی بھی معاشرے کی بنیاد اساتذہ کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ اردو سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جس سے قومی یک جہتی کے سارے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ National Integration کا اگر کوئی کارگر آلہ بن سکتا ہے تو صرف ایک زبان ہے اور وہ ہے اردو۔

پروگرام کے آغاز میں اردو اکادمی دہلی کے سابق سکریٹری سید شریف الحسن نقوی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ بعد ازاں اس اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر کے پرنسپل (مشہور فکشن نگار) اور اس کورس کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر غضنفر نے اپنے مرکز اور ادارے کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ ان کے مرکز نے گزشتہ چند برسوں میں ملک کی مختلف ریاستوں میں پرائمری سطح سے لے کر کالج کی سطح تک کے اردو اساتذہ کے لیے درس و تدریس کے مختلف موضوعات و مسائل پر اورینٹیشن کورسیز، تعلیم کے طریقۂ کار پر سمینار، اور زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت پر ورکشاپ منعقد کرانے کے علاوہ سول سروسیز امتحانات کی تیاری کے لیے کورس میٹیریل بدلیں۔ مرقعاتِ غالب کی فرہنگ، مختصر ہندی اردو لغت، معاصر اردو غزل کی انتھولوجی، معاصر اردو افسانے کی انتھولوجی، قومی یک جہتی کے موضوع پر لکھی گئی نظموں کا جامع انتخاب، کے مسودے تیار کرائے۔ جو جلد ہی منظرِ عام پر آنے والے ہیں۔ جلسے کی صدارت م. افضل وائس چیئرمین اردو اکادمی دہلی نے کی اور قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ڈاکٹر روپ کشن بھٹ نے مہمان ذی وقار کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوئے اورینٹیشن کورس کی اہمیت اور سی آئی آئی ایل میسور کی مختلف سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری جناب مرغوب حیدر عابدی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس اورینٹیشن کورس میں پچاس اردو اساتذہ کے علاوہ، دہلی کے اردو اسکالر، شاعر، ادیب اور دانشوروں نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہندی اردو ڈکشنری ورکشاپ

● نئی دہلی۔ اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ اور شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام ہندی اردو ڈکشنری کی ہفت روزہ ورکشاپ کے اختتامی اجلاس کی صدارت شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کی۔ مقررین نے اس موقعے پر لغت نویسی کی مختلف جہات پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر فرحت احساس، عراق رضا زیدی، ڈاکٹر غضنفر علی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر صغیر افراہیم، ڈاکٹر صفدر امام قادری، نگار عظیم اور ڈاکٹر ابن کنول نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور ہندی اردو لغت کی اہمیت و افادیت پر روشنی ڈالی۔ اس ورک شاپ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی کے اساتذہ اور اسکالرز نے شرکت کی۔

(عالمی سہارا، دہلی)

اتر پردیش اردو فارسی مدرسہ بورڈ کی تشکیل

● لکھنؤ، 27/جولائی۔ اتر پردیش سرکار نے ریاست کے مدارس کا تعلیمی معیار بلند کرنے کے لیے اردو فارسی مدرسہ بورڈ کی تشکیل کی ہے۔ ریاستی پارلیمانی امور اور شہری ترقیات کے وزیر محمد اعظم خاں کے مطابق اس بورڈ کا چیئرمین مولانا خالد اشرف کو بنایا گیا ہے۔ اس ضمن میں جلد ہی ایک بل بھی لایا جائے گا۔ مسٹر اعظم خاں نے یہ بھی بتایا کہ سرکار نے اقلیتی کمیشن بھی بنا دیا ہے اور شیخ سلمان اس کے چیئرمین ہوں گے۔ کمیشن کی مدت تین سال ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ ملک میں پہلی بار کمیشن کو بااختیار بنایا گیا ہے۔ کمیشن افسران کو طلب کرسکتا ہے اور قصوروار پائے جانے پر سزا بھی دے سکتا ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

ڈاکٹر کامل قریشی کی یاد میں جلسہ اور مشاعرہ

● نئی دہلی، 31/جولائی۔ ''تعلیمی پسماندگی کو دور کیے بغیر قومی مسائل کا حل ممکن نہیں ہے۔ جو لوگ ادب کے ذریعے اردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں وہ لائق تحسین ہیں۔'' ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر برائے سائنس اور ٹیکنالوجی جناب کپل سبل نے کیا۔ وہ ڈاکٹر کامل قریشی کی گیارہویں برسی کے موقعے پر منعقد ادبی و ثقافتی تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے اظہار خیال کررہے تھے۔ تقریب کا اہتمام قریش نگر پبلک ویلفیئر سوسائٹی نے کیا تھا۔ تقریب کا افتتاح مجاہد آزادی سردار خوشحال سنگھ نے کیا جبکہ صدارت آرٹسٹ رشید چودھری نے کی۔

تقریب میں سمینار اور مشاعرے کے علاوہ مختلف میدانوں میں نمایاں خدمات انجام دینے والی شخصیات کو ایوارڈ دیا گیا جس میں ڈی سی پی (شمال) راجیش کھورانہ، اے سی پی شیام سنگھ، معصوم مرادآبادی، شمیم حنفی، معین اختر انصاری، جعفر علی خاں، حکیم امام الدین ذکائی، حکیم شہاب الدین، عمران عظیم اور عائشہ ظفر شامل ہیں۔ سمینار اور مشاعرے میں شرکت کرنے والی شخصیات میں مخمور سعیدی، ظفر مرادآبادی، معین شاداب، اعجاز انصاری، شہباز ندیم ضیائی، صالحین نہٹی، مولا بخش، شعیب رضا وارثی، شاہد یوسفی، عمران احمد، راشد حامدی کے نام شامل ہیں۔ مشاعرے کی نظامت معین انصاری نے کی اور حبیب احمد نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

مرادآباد میں باب جگر کا افتتاح

● مرادآباد، 25/جولائی۔ اتر پردیش کے وزیر شہری ترقیات اور پارلیمانی امور جناب محمد اعظم خاں نے عظیم شاعر مرحوم علی سکندر جگر مرادآبادی کی یاد میں تعمیر کرائے گئے ''باب جگر'' کی نقاب کشائی کی۔ عیدگاہ روڈ پر سنبھل چوراہے کے نزدیک تعمیر کرائے گئے باب جگر کا سنگ بنیاد بھی محمد اعظم خاں نے اسی سال جنوری میں رکھا تھا۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ جگر کی یاد میں اور بھی بہت کچھ جگر کے شہر میں کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موقعے پر شہر امام حکیم سید معصوم علی آزاد، میئر دینا اگروال، سابق میئر ہمایوں قدیر اور ڈاکٹر شفیق الرحمٰن برق ایم پی کے ساتھ ساتھ کئی افسران اور ایس ایس پی ڈاکٹر جی کے گوسوامی بھی موجود تھے۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رضا لائبریری میں 10 ہزار ڈاٹا شیٹس مکمل

● رام پور، 3/جولائی۔ رضا لائبریری میں قومی مشن برائے مخطوطات کے سلسلے میں ایک میٹنگ مشن کی ڈائرکٹر، ڈاکٹر سدھا گوپال کرشن کی صدارت میں ہوئی جس میں ڈاکٹر گوتم بوس ڈپٹی ڈائرکٹر، ڈاکٹر ایس ایم باقر ڈپٹی ڈائرکٹر نیشنل آرکائیوز، پارتھک شری واستو ٹیکنکل ڈائرکٹر، ڈاکٹر امتیاز احمد ڈائرکٹر خدابخش لائبریری پٹنہ، پروفیسر ڈاکٹر شاہ عبدالسلام، پروفیسر شریف احمد قاسمی اور پروفیسر اقتدار حسین صدیقی کے علاوہ رضا لائبریری کے ذمے داروں نے شرکت کی۔ او ایس ڈی رضا لائبریری ڈاکٹر وقارالحسن صدیقی نے رضا لائبریری میں مشن کے ذریعے کیے گئے کاموں سے روشناس کراتے ہوئے بتایا کہ رضا لائبریری اب تک دس ہزار ڈاٹا شیٹس تیار کرچکی ہے اور کئی اضلاع کا جائزہ لے کر تقریباً ساٹھ ہزار مخطوطات کا پتہ لگا چکی ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

جلسہ تقسیم اسناد

● بنارس، 18/جولائی۔ قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام چلائے جارہے کمپیوٹرائزڈ کیلی گرافی ٹریننگ سینٹر کا جلسہ تقسیم اسناد الجامعۃ الفاروقیہ انفارمیشن ٹیکنالوجی سینٹر میں منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت کاشی ودیاپیٹھ کے وائس چانسلر پروفیسر سریندر سنگھ نے کی اور مقرر خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر قمر جہاں سابق صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی نے شرکت کی۔

اس موقعے پر ڈاکٹر قمر جہاں نے کہا کہ مذہبی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم حاصل کرنا لازمی ہے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں عزت اور احترام کے ساتھ اپنی روزی کما سکیں اور ملک کی ترقی میں بھی اپنا کردار ادا کرسکیں۔ پروفیسر سریندر سنگھ نے کہا کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں ٹیکنکل تعلیم کی بڑی اہمیت ہے خصوصاً کمپیوٹر کی تعلیم، کیونکہ صنعت وحرفت سے لے کر زندگی کے ہر شعبے میں کمپیوٹر کا اپنا ایک اہم مقام ہے۔ سینئر انچارج الحاج شاہد مسعود نے اپنی خیر مقدمی تقریر کے دوران کہا کہ یہ بے حد پرمسرت امر ہے کہ جن طلبہ کو آج اسناد سے نوازا جارہا ہے ان میں سے بیشتر طلبہ اندرونِ ملک کے علاوہ بیرونِ ملک سعودی عرب اور کویت جیسے خلیجی ممالک میں ملازمتوں کے لیے منتخب کیے جاچکے ہیں۔

تقریب میں جامعہ کے صدر علی احمد، منیجر محمد صالح، چیئرمین محمد شعیب نوری، سکریٹری محمد الیاس، عاصم ظفر، محمود جمال صاحبان سمیت بڑی تعداد میں علاقے کے معزز اشخاص اور اساتذہ وطلبہ نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

مشتاق احمد انصاری راجستھان مدرسہ بورڈ کے نئے چیئرمین

● جے پور، 2/اگست۔ راجستھان سرکار نے مشتاق احمد انصاری کو راجستھان مدرسہ بورڈ کا نیا چیئرمین نامزد کیا ہے۔ ان کی تقرری اس عہدے پر تین سال کے لیے کی گئی ہے۔ مسٹر انصاری اس سے قبل سینٹرل جیل میں آئی جی بھی رہ چکے ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

اردو ادب کی ترقی کے لیے کل ہند ''الکلام ایوارڈ''

● بنگلور، 29/جولائی۔ کل ہند اردو فورم ٹرسٹ نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کے لیے قومی سطح کے ''الکلام انعام'' کے قیام کا اعلان کیا ہے۔ اس کے تحت پانچ لاکھ 59 ہزار روپے کے نقد انعام کے ساتھ ہی ایک ٹرافی بھی دی جائے گی۔ ٹرسٹ نے اردو شاعری اور نثر میں بہترین تخلیقات کے دو انعامات کا اعلان کیا ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

مختصرات

● بھوپال، 24/جولائی۔ پندرہ روزہ ''صدائے اردو'' اور ''بزمِ فنکار'' کے زیر اہتمام ممتاز ادیب اور صحافی جناب کوثر چاند پوری کی 104ویں سالگرہ کے موقعے پر پروفیسر آفاق احمد کی صدارت میں ایک ادبی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت جناب عشرت قادری نے کی۔ اس موقعے پر رشید انجم نے کوثر چاند پوری کے فن اور شخصیت پر مقالہ پیش کیا۔ معروف افسانہ نگار اقبال مجید نے کوثر صاحب سے اپنے دیرینہ تعلقات کا ذکر کیا۔

کوثر چاند پوری کے صاحبزادے، ''صدائے اردو'' کے ایڈیٹر اور افسانہ نگار نعیم کوثر نے ان کا افسانہ ''نئی ارتھی'' سنایا۔ اس ادبی محفل میں پروفیسر شفیقہ فرحت، پروفیسر اظہر راہی، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر قاسم نیازی، وحید پرواز، کامل بہزادی، سید حفیظ، احمد علی اشرف، پروفیسر حیدر عباس رضوی، بدرواسطی، رہبر جونپوری، ارمان اکبرآبادی اور عزیز روشن کے علاوہ ای. ٹی. وی. اردو کے نمائندے مہتاب عالم بھی موجود تھے۔ (ڈاک سے)

● منگرول پیر، 3/جولائی۔ قومی اردو کونسل کی جانب سے قلندریہ اردو ہائی اسکول و جونیر کالج منگرول پیر ضلع واشم (مہاراشٹر) میں ایک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا جس کا عنوان تھا ''امراوتی ڈویژن میں صدر مدرسین کا اردو کے فروغ میں کردار''۔ سمینار کا افتتاح جناب سبھاش راؤ ٹھاکرے وزیر مملکت برائے جنگلات نے کیا اور صدارت امراوتی ڈویژنل بورڈ کے چیئرمین جناب سید اختر حسن عابدی نے کی۔ سمینار کے کنوینر ڈاکٹر ظفر خاں پٹیل نے بتایا کہ امراوتی ڈویژن میں 193 اردو ہائی اسکول ثانوی تعلیم بذریعۂ اردو زبان دے رہے ہیں۔ تقریباً دس ہزار طلبہ دسویں جماعت کے بورڈ کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں۔ امسال امراوتی بورڈ میں گیارہ اردو میڈیم کے طلبہ و طالبات نے امتیازی مقام حاصل کیا۔ اردو میڈیم کی ہی ثنا پیکر سرفہرست رہیں۔

سمینار میں شاہ بابو ہائی اسکول و جونیر کالج کے صدر مدرس جناب الحق راہی نے امراوتی ڈویژن میں اردو زبان کے فروغ پر سروے رپورٹ اور اردو کے مسائل اور ان کے تدارک کے لیے تجاویز پیش کیں۔ بعد ازاں ڈاکٹر یوسف خاں افغانی، ڈاکٹر غلام کبریا خاں شبلی، محمد انصار اللہ انعامدار اور مولانا آزاد بی ایڈ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر دوست محمد خاں نے مقالے پیش کیے۔ جناب سید اختر حسن عابدی نے اپنے صدارتی خطبے میں طلبہ کی ہمہ جہت ترقی پر زور دیا۔ تقریب کی نظامت جناب محمد یحییٰ جمیل نے انجام دی اور ادارے کے سپر وائزر جناب عبدالخالق شیخ نے ہدیہ تشکر پیش کیا۔ (ڈاک سے)

● سہارنپور۔ ''نظریات سے عاری نظامِ تعلیم کی وجہ سے ہندستانی معاشرے میں اخلاقی اقدار زوال پذیر ہیں اور لاقانونیت کا بول بالا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار جماعت اسلامی کے سکریٹری مولانا اشفاق احمد نے تعلیمی بیداری مہم کے تحت ہونہار طلبہ کی تقریب تقسیم انعامات میں کیا جس کا اہتمام جماعت اسلامی اور ایس آئی او نے اسلامیہ انٹر کالج میں کیا تھا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ فروغ تعلیم کے مسئلے میں حکومت، سماج، تعلیمی ادارے اور سرپرست سب کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔

اس موقعے پر مہمان خصوصی وزیر تعمیرات عامہ سنجے گرگ، جماعت اسلامی کے ناظم ضلع حبیب احمد، ڈاکٹر قدسیہ انجم، ڈاکٹر جاوید جمیل، ڈاکٹر شاہد زبیری، اختر علی خاں پرنسپل اسلامیہ انٹر کالج، پرنسپل گرو تیغ بہادر، چودھری ہاشم سابق پرنسپل اسلامیہ انٹر کالج، ڈاکٹر آلوک ونگ کمانڈر ایئر فورس نے طلبہ سے خطاب کیا۔ اس تقریب کی نظامت ڈاکٹر جمیل معنوی اور محمد شعیب نے کی۔

(ڈاک سے)

● انٹرنیشنل بزنس کونسل، نئی دہلی نے اردو کے جواں سال ادیب ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر جیول آف انڈیا

(2003-04) ایوارڈ سے نوازا ہے۔ یہ ادارہ ملک گیر سطح پر مختلف میدانوں میں کام کرنے والے ماہرین اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن صدیقی کی کئی کتابیں اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ساہتیہ اکیڈمی اور نیشنل بک ٹرسٹ کی بعض اہم کتابوں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ موصوف اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر (حکومتِ ہند)، سولن میں ریڈر کے عہدے پر فائز ہیں۔ (ڈاک سے)

● باراچکیا، مشرقی چمپارن۔ شہر کے متصل بستی کوآواں شریف میں ڈاکٹر حاتم جاوید کی صدارت میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں انجمن ترقی اردو کے عہدیداران کا انتخاب عمل میں آیا۔ جناب فروغ عالم جامی صدر، ڈاکٹر حاتم جاوید، محمد ماہتاب عالم (کھیا)، مولانا عبدالقیوم اشعر اور محمد جمیل اختر نائب صدر، شکیل شاغل سکریٹری، محمد وسیم رضا، مثنیٰ افضل اور مشتاق احمد جوائنٹ سکریٹری اور محمد نجیب الرحمٰن کو خازن منتخب کیا گیا۔ اس کے علاوہ تدریس اور اردو تحریک سے جڑی دیگر شخصیات کو تنظیم کا ممبر بنایا گیا ہے۔ (ڈاک سے)

● موتیہاری۔ اردو کے حقوق کی بازیابی اور اسے عوام میں مقبول بنانے کے لیے اردو فورم کا قیام عمل میں آیا ہے جس کے کنوینر ظفر مجیبی ہیں۔ اس موقعے پر اردو کے فروغ کے لیے انجمن ترقی اردو، بزم عترت، اردو کتب خانہ، اقلیتی فورم اور انجمن اسلامیہ موتیہاری کے ساتھ مشترکہ مہم چلانے، پرائمری اور ہائی اسکولوں، کالجوں اور مدارس میں اردو اساتذہ اور طلبہ کا سروے کرانے اور سرکاری تعلیمی اداروں میں اردو اساتذہ کے خالی عہدوں کو پُر کرنے کے لیے تحریک چلانے اور اسکول کی نصابی کتابیں اردو میں فراہم کرانے کے لیے محکمۂ تعلیم پر جمہوری دباؤ بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس میٹنگ میں فاروق راہب، اختر صدیق، تفضیل احمد، ضمیر احمد، محبوب عالم، انعام الحق، پروفیسر عظیم الدین، وصی احمد قادری اور رفیع احمد آفتاب نے شرکت کی۔ (ڈاک سے)

● چنڈی گڑھ اردو کے معروف ادیب شری شیام سندر آنند لہر کو ان کی نمایاں ادبی خدمات کے اعتراف میں خصوصی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انھیں یہ انعام کیندر کے ڈائرکٹر شری ایم ایل کوثر، نامور ڈرامہ نگار سردار گرشرن سنگھ و عالمی شہرت یافتہ کتھک ڈانسر شریمتی شوبھا کوثر کے ذریعے چنڈی گڑھ کے ٹیگور ہال میں منعقدہ ایک تقریب میں دیا گیا۔ شری آنند لہر کی سات کتابیں ہیں جن میں دو افسانوی مجموعے، تین ناول اور دو ڈراموں کے مجموعے شامل ہیں۔ وہ انجمن ترقی اردو ہند کے قانونی سیل کے رکن ہیں اور جموں کشمیر ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کے صدر رہ چکے ہیں۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی، 12 رجولائی۔ دہلی کی ادبی اور ثقافتی تنظیم "سب رنگ" کے زیرِ اہتمام ذاکر نگر میں ایک ادبی اور شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت معروف فکشن نگار اور اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سینٹر لکھنؤ کے پرنسپل ڈاکٹر غضنفر علی نے کی۔ مہمانانِ خصوصی کے طور پر ڈاکٹر عبدالسنان طرزی، جناب صفدر امام قادری اور جناب ابوبکر رضوی نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبیدالرحمٰن نے ادا کیے۔ جناب عبدالمالک فہیم مہمانِ ذی وقار تھے۔ اس موقعے پر یوجنا کے ایڈیٹر ڈاکٹر ابرار رحمانی نے فروغ اردو اور اسے دوسری قومی زبان بنانے سے متعلق اپنا مضمون پیش کیا جس میں انھوں نے تمام سرکاری اسکولوں میں اردو کے اساتذہ کی بحالی پر بھی زور دیا۔ اس مضمون پر جناب خورشید اکرم، ڈاکٹر مولا بخش، ظفر عدیم، پروفیسر زبیر احمد اور ڈاکٹر کوثر مظہری نے اظہارِ خیال کیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عبیدالرحمٰن نے کہا کہ ہمیں تمام مصلحتوں اور نجی مفاد سے اوپر اٹھ کر صدق دل سے اردو کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے محض اکیڈمیاں یا یونیورسٹی کے قیام سے اردو کے مسائل حل نہیں ہو سکتے ہم سرکار اردو کے تئیں سنجیدہ ہے مگر ہم خود ہی اپنی زبان کے تئیں سنجیدہ نہیں ہیں۔

جناب عبدالمالک فہیم نے اس صورتِ حال پر تشویش کا اظہار کیا کہ اردو کے قاری روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے محلّے کی سطح پر اردو کی لائبریریاں قائم کرنے کی تجویز رکھی۔ ڈاکٹر غضنفر علی نے یہ مشورہ دیا کہ اردو والوں کو اپنے بچوں کا اردو سے جذباتی رشتہ قائم کرنا چاہیے۔ بعد ازاں ایک شعری مجلس منعقد ہوئی جس میں ڈاکٹر غضنفر علی، ابرار کرتپوری، ظفر عدیم، ڈاکٹر عبدالسنان طرزی، یاس چاندپوری، ڈاکٹر کوثر مظہری، ڈاکٹر ماجد دیوبندی، شعیب مرزا، عادل حیات، ڈاکٹر مولا بخش اسیر، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن، ڈاکٹر مشتاق صدف، عرفان احمد، عبدالقادر حفیظ اور عمیر منظر نے اپنا کلام پیش کیا۔

(ڈاک سے)

● نئی دہلی، 13 رجولائی۔ "اردو ادارہ دہلی" کی جانب سے ایک مشاعرہ بعنوان "محبتوں بھری ایک شام حبیب احمد کے نام" راجندر بھون میں منعقد ہوا، جس کی صدارت شمیم احمد سیفی نے کی۔ اس موقعے پر سماجی خدمات کے لیے محمد علی قریشی کو، ادبی خدمات کے اعتراف میں نرمل سنگھ نرمل رائے پوری کو (کنور مہندر سنگھ بیدی سحر ایوارڈ) نئی نسل کے نمائندہ شاعر سکندر عاقل کو (کفیل آزر ایوارڈ) اور عوامی خدمت کے لیے ڈاکٹر عرفان احمد کو (ڈاکٹر محبوب احمد صدیقی ایوارڈ) پیش کیے گئے۔ نظامت کے فرائض معین شاداب نے انجام دیے۔ آخر میں "اردو ادارہ دہلی" کے جنرل سکریٹری اور کنوینر شہباز ندیم ضیائی نے شکریہ ادا کیا۔ مشاعرے میں جناب مخمور سعیدی، وقار مانوی، نظمی سکندر آبادی، ابرار کرتپوری، شاد فدائی، قمر سنبھلی، تابش مہدی، ظفر مرادآبادی، ساحل سحری، نرمل سنگھ نرمل، سکندر عاقل، شہباز ندیم ضیائی، عازم کوہلی، ماجد دیوبندی، اقبال اشہر، اعجاز انصاری، انور باری، شعیب مرزا، اقبال فردوس، معین شاداب، صالحین فہمی، راشد حامدی اور ترنم نشاط نے اپنے کلام سے نوازا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

رسم اجرا

بہارِ نوبہار

● نوئیڈا، یکم اگست۔ نورنگ کتاب گھر کے زیرِ اہتمام ایک ادبی جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی نظامت اور میزبانی جناب رفعت سروش نے کی۔ صدارت کے فرائض بزرگ شاعر گلزار دہلوی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر رفعت سروش نے جگن ناتھ آزاد سے اپنی قربت کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی بلند اخلاقی، شائستگی، اردو دوستی، شاعری اور بالخصوص اقبالیات سے اُن کی والہانہ وابستگی کا ذکر کیا بعد ازاں مظہر امام نے جگن ناتھ آزاد پر ایک مختصر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال کے بارے میں انھوں نے اس زمانے میں مضامین لکھنے شروع کیے جب ہندستان میں آزادی کے بعد اقبال کا نام لینا بھی ایک طرح سے جرم سمجھا جاتا تھا۔ گلزار دہلوی نے اپنے ساٹھ سالہ تعلقات کے حوالے سے آزاد صاحب کو یاد کیا۔ بعد ازاں بزرگ ادیب اور ''تناظر'' کے ایڈیٹر بلراج ورما نے رفعت سروش کے مضامین کے تازہ مجموعے ''بہارِ نوبہار'' کا اجرا کیا جس میں مصنف نے بہار کے سات ادیبوں اور شاعروں پر مضامین لکھے ہیں۔

اس ادبی محفل میں رفعت سروش نے ایک مضمون بہ عنوان ''اقبال کی نظموں میں طنزیہ پہلو — ابلیس'' پیش کیا جس میں کلامِ اقبال کے ان طنزیہ اشعار کی نشاندہی کی گئی جو روایتی کردار ''ابلیس'' سے متعلق ہیں۔ مظہر امام نے مضمون پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن رفعت سروش نے اس میں ایک نئی جہت پیش کی ہے۔ ملک زادہ جاوید، تابش مہدی اور عبید الرحمٰن نے بھی اس محفل میں اظہارِ خیال کیا۔ (ڈاک سے)

عہدِ مغلیہ میں فارسی تاریخ نویسی

● منگرول پیر، 3 رجولائی۔ قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے شائع شدہ ڈاکٹر ظفر خاں پٹیل کی کتاب ''عہدِ مغلیہ میں فارسی تاریخ نویسی'' کا اجرا قلندریہ اردو جونیر کالج، منگرول پیر میں وزیرِ مملکت مہاراشٹر جناب سبھاش راوٹھاکرے کے ہاتھوں ہوا۔ اس موقعے پر جناب سید اختر حسن عابدی (چیئر مین، امراوتی سیکنڈری اور ہائر سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ)، ڈاکٹر دوست محمد خاں (پرنسپل، مولانا آزاد کالج آف ایجوکیشن، اورنگ آباد) ایڈووکیٹ کاظمی، جناب جمیل احمد خاں، جناب محمد انصار اللہ انعامدار بھی موجود تھے۔

ڈاکٹر ظفر خاں پٹیل نے اپنی کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ سب سے زیادہ طلبہ و طالبات کو کوئی مضمون اگر مشکل نظر آتا ہے تو وہ ہے تاریخ۔ میں نے اس کتاب میں فنِ تاریخ، تاریخ نویسی کی ابتدا، عالمی سطح پر تاریخ نویسی پر روشنی ڈالتے ہوئے ہندستان میں مسلمانوں کی آمد سے اس فن میں جو تبدیلی آئی اور آخر میں مغلوں نے اس فن کی کیسی آبیاری کی، اس پر گفتگو کی ہے۔ اس تقریب کی نظامت جناب محمد یحیٰ جمیل نے کی اور جناب عبدالخالق شیخ نے ہدیۂ تشکر پیش کیا۔

ڈاکٹر محمد طیب انصاری کی ادبی خدمات

● گلبرگہ، 12 رجولائی۔ ''محقق کے لیے ضروری ہے کہ اسے تحقیق کے اصولوں سے کماحقہٗ واقفیت ہو۔ ریسرچ اسکالروں کو غیر جانبداری اور شفافیت پر مبنی تحقیق کرنی چاہیے۔'' ان خیالات کا اظہار جناب وہاب عندلیب ڈائرکٹر آف اسٹڈیز خواجہ ایجوکیشن سوسائٹی، گلبرگہ نے بزمِ امان اردو گلبرگہ کے زیرِ اہتمام محترمہ ممتاز بیگم کے تحقیقی مقالے ''ڈاکٹر محمد طیب انصاری کی ادبی خدمات'' کے رسمِ اجرا کے موقعے پر اپنے صدارتی کلمات میں کیا۔ شریف احمد قریشی صدر انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ گلبرگہ نے مذکورہ مقالے کی رونمائی کی اور کہا کہ جن شخصیات میں ابھرنے کی صلاحیت ہوتی ہے وہ خود بخود ابھر کر سامنے آتے ہیں، ڈاکٹر طیب انصاری ان ہی میں سے ایک ہیں۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر صدر شعبۂ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی نے کہا کہ ڈاکٹر طیب انصاری ایک حرکیاتی شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی تحریروں میں دلیری و بے باکی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر جلیل تنویر صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج سیڑم نے کہا کہ تنقید اور تحقیق فن کار کی موت کے بعد ہونی چاہیے، یہ ایک مفروضہ ہے کوئی کلیہ نہیں ہے۔ زندہ شخصیات کی معیاری تخلیق اور تحقیق پر یقیناً تحقیق ہونی چاہیے۔ ڈاکٹر طیب انصاری نے اپنے ہمہ جہت تخلیقی سفر کے 50 سال مکمل کیے ہیں۔ اس موقعے پر انھوں نے مصنفہ محترمہ ممتاز بیگم کو مبارک باد دی۔ مہمانِ خصوصی ڈاکٹر طیب انصاری پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، کملا پور نے اس موقعے پر حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس جلسے میں اساتذہ اور طلبہ کی کثیر تعداد موجود تھی۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

پروفیسر جگن ناتھ آزاد

● نئی دہلی، 25 رجولائی۔ اردو کے ممتاز ادیب اور شاعر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا 24 رجولائی کی رات 9 بجے طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ پروفیسر آزاد علمی و ادبی دنیا میں اپنی دانشوری اور خوش اخلاقی کی وجہ سے بے حد ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ہندستان کی گنگا جمنی تہذیب کے علَم بردار تھے۔ ان کی عمر 86 سال تھی، مگر زندگی کے آخری مرحلے تک وہ سرگرمِ عمل رہے۔

پروفیسر آزاد کی آخری رسوم لودھی روڈ شمشان گھاٹ پر ادا کی گئیں۔ اس موقعے پر ان کی بیوہ، دو بیٹے، دو بیٹیاں اور متعدد دیگر قریبی اعزہ کے علاوہ ان کے بہت سے مداح اور اردو ادیب، شاعر اور صحافی موجود تھے جن میں خواجہ حسن ثانی نظامی، ڈاکٹر خلیق انجم، گلزار زتشی دہلوی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر

قمر رئیس، پروفیسر شمیم حنفی، رفعت سروش، نند کشور وکرم، شاہد خاں اور سید منصور آغا وغیرہ شامل تھے۔

پروفیسر آزاد 15 دسمبر 1918 کو مغربی پنجاب (پاکستان) کے شہر عیسیٰ خیل میں پیدا ہوئے۔ وہ اردو کے معروف شاعر تلوک چند محروم کے فرزند تھے۔ آزاد صاحب کی ابتدائی تعلیم عیسیٰ خیل ہی میں ہوئی۔ بعد میں انھوں نے میاں والی پاکستان سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1935 میں ڈی اے وی کالج راولپنڈی سے انٹرمیڈیٹ، 1937 میں گارڈن کالج راولپنڈی سے بی اے اور 1944 میں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے فارسی میں ایم اے کیا۔ 1941 میں اردو کے مشہور ماہنامہ رسالے "ادبی دنیا" لاہور کی مجلسِ ادارت سے وابستہ ہوئے۔

1946 میں ایک سال کے لیے اردو روزنامہ "جے ہند" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1947 میں پاکستان سے ہندستان ہجرت کر گئے اور اپنے والد کے ساتھ دہلی میں سکونت اختیار کرلی۔ یہاں وہ روزنامہ "ملاپ" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے اور پھر پبلی کیشن ڈویژن گورنمنٹ آف انڈیا میں اسسٹنٹ ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1935 میں پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔ 1964 میں منسٹری آف فوڈ میں اسی عہدے پر فائز ہوئے۔ 1966 میں منسٹری آف ورکس اینڈ ہاؤسنگ میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہوئے۔ اس کے بعد جنوری 1968 میں پریس انفارمیشن بیورو میں ڈپٹی پریس انفارمیشن افسر مقرر ہوئے اور 1973 میں پریس انفارمیشن بیورو میں ڈائرکٹر کے عہدے پر ان کا تقرر ہوا۔ 1977 سے 1980 تک پروفیسر جگن ناتھ آزاد جموں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ 1984 میں پروفیسر ایمریٹس جموں یونیورسٹی مقرر ہوئے۔ 1988 میں ان کا یہ تقرر تاحیات کر دیا گیا۔

پروفیسر آزاد کے تقریباً پندرہ شعری مجموعے اور دس بارہ طویل نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ ان کی نثری کتابوں کی تعداد لگ بھگ 20 ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے انتقال پر دہلی یونیورسٹی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی نئی دہلی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، بنارس ہندو یونیورسٹی، مولانا آزاد اردو یونیورسٹی حیدرآباد، پٹنہ یونیورسٹی، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، ملت کالج دربھنگہ کے شعبہ ہائے اردو اور انجمن ترقی اردو (ہند) کے علاوہ دیگر ادب دوستوں نے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ (قومی آواز، دہلی)

اداکار محمود

● ممبئی، 23 رجولائی۔ پانچ دہائیوں پر مشتمل اپنے فلمی کیریر میں سب کو ہنسانے والے ہر دل عزیز اداکار محمود چل بسے۔ ان کی عمر 72 سال تھی اور وہ طویل عرصے سے علیل تھے۔ اپنی زندگی میں ہمیشہ سب کے ہونٹوں پر تبسم بکھیرنے والے محمود نے 300 سے زیادہ فلموں میں کام کیا۔ وہ فلمی دنیا کے واحد ایسے اداکار تھے جنھوں نے مزاح کو عروج پر پہنچایا۔ زبردست صلاحیت والا یہ اداکار جب اپنے عروج پر تھا تو اس دور کے فلمی اداکار اس سے خوف کھاتے تھے۔ ایک بار تو ایک اداکار نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس فلم میں محمود بھی ہوں گے تو وہ اس فلم میں کام نہیں کریں گے۔

محمود 29 ستمبر 1932 کو ممبئی میں پیدا ہوئے تھے۔ انھوں نے پہلی بار 1943 میں صرف گیارہ سال کی عمر میں "قسمت" فلم میں اداکاری کی تھی۔ بالی ووڈ میں کامیڈی کنگ کے نام سے مشہور محمود اپنے شروع کے دور میں چھوٹے موٹے رول بھی کرتے تھے۔ بلیک اینڈ وھائٹ فلموں کے دور سے رنگین فلموں تک لوگوں کو ہنسا ہنسا کر بے حال کرنے والے محمود نے بعض فلموں میں اپنے رول سے لوگوں کو رلایا بھی تھا۔ اخبار بیچنے اور مرغی پالنے کا کام کرنے والے محمود نے کبھی مینا کماری کو ٹینس کھیلنا بھی سکھایا تھا۔ بعد میں انھوں نے مینا کماری کی بہن سے شادی بھی کرلی۔ جانی واکر کے بعد اب محمود کی موت سے فلمی دنیا میں مزاحیہ اداکاری کے سنہرے دور کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

سلطانہ جعفری

● نوئیڈا، 17 رجولائی۔ دنیائے اردو کی مشہور قلم کار و مصنفہ قرۃ العین حیدر نے علی سردار جعفری کی اہلیہ بیگم سلطانہ جعفری کے انتقال پر اپنے تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ وہ علی گڑھ کی نامور خواجہ فیملی کی ایک فرد تھیں۔ وہ ہندستان کی صفِ اوّل کی باشعور اور اعلا تعلیم یافتہ سیاسی، سماجی کارکنوں میں شامل تھیں۔ عصمت چغتائی سے ان کی رشتے داری کے علاوہ گہری دوستی بھی تھی۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کیا تھا اور ترقی پسند تحریک میں شامل ہو گئی تھیں۔ علی سردار جعفری سے شادی کے بعد وہ اس تحریک کی ایک فعال رکن رہیں۔ وہ خود ادیب نہیں تھیں لیکن شعر و سخن کا اچھا ذوق رکھتی تھیں۔ ایسی گوناگوں خوبیوں کی مالک خواتین اب ہمیں گرد و پیش میں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ سردار کے جانے کے بعد وہ چار سال زندہ رہیں اور جب بھی سردار کا ذکر آتا، وہ زار و قطار رونے لگتیں۔ اب سلطانہ آپا بھی ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئیں۔

نسیم آذر

● دربھنگہ۔ نوری اردو مرکز کے زیر اہتمام مشہور ناظم مشاعرہ اور شاعر نسیم آذر کا آسنسول (بنگال) میں طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر تقریباً 65 سال تھی۔ ان کی پیدائش برہولیا، دربھنگہ، بہار میں ہوئی۔ وہ تقریباً 40 سال سے آسنسول میں مقیم تھے۔ نسیم آذر کے سانحۂ ارتحال پر ایک تعزیتی نشست "انجمن بیت الفلاح" کے صدر ڈاکٹر مشتاق حاذق زبیر کی صدارت میں ہوئی۔ نظامت کے فرائض سکریٹری نوری اردو مرکز جناب اظہر نیر نے انجام دی۔ نشست میں مرحوم نسیم آذر کی شخصیت اور شاعری اور دیگر علمی و ادبی سرگرمیوں پر گفتگو کی گئی۔

□□□

تبصرہ و تعارف

تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر/ ڈاکٹر سلامت اللہ

صفحات: 272، قیمت: -/65 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1
آر کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: ریاض الدین

تعلیم کی اہمیت و افادیت پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ جس سماج، ملک اور قوم نے تعلیم کی اہمیت کو سمجھا اور اپنایا اس نے اتنی ہی ترقی کی اور دوسری اقوام پر غلبہ بھی پایا۔ تعلیم صرف انفرادی معاملہ نہیں اس کا ایک سماجی مقصد بھی ہے، جس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کا شامل ہونا ضروری ہے تاکہ اجتماعیت کا فروغ ہو اور تعلیم و سماج کا باہمی رشتہ قائم رہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب ''تعلیم اور اس کا سماجی پس منظر'' ڈاکٹر سلامت اللہ کا بیش بہا تحقیقی مقالہ ہے جو سماج اور تعلیم کے مسائل پر ایک صحیح سمت عطا کرتا ہے۔

کتاب تین حصّوں میں منقسم ہے اور ہر حصے کو کئی ابواب میں بانٹا گیا ہے۔ پہلا حصّہ ''تعلیم کا مفہوم اور مقاصد'' ہے۔ جس میں تعلیم کے سماجی پس منظر، معنی و مفہوم نیز اس کے سماجی رشتے کو بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی تعلیم کی بعض اہم خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس حصے میں کتابی تعلیم، طفل مرکوز تعلیم اور حیات مرکوز تعلیم کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ ''کتابی تعلیم'' میں نصاب اور درس و تدریس سے بحث کی گئی ہے اور اس کے مختلف طریقۂ کار کو سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''طفل مرکوز تعلیم'' میں بچے کی آزادیٔ عمل اور اظہار ذات کو فوقیت دی گئی ہے۔ روسو، پستالوزی، فروبیل، مون ٹیسری، ٹیگور وغیرہ مفکرین اور ماہرین تعلیم کے نظریات کو بھی پیش کیا گیا ہے اور ہندستان کی بنیادی تعلیم پر ڈاکٹر ذاکر حسین کمیٹی (1937) کی جو مہاتما گاندھی کی بنیادی تعلیم کے اصولوں کی روشنی میں قائم کی گئی تھی، تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ ''حیات مرکوز تعلیم'' میں تعلیم اور زندگی کے باہمی رشتے کو اُجاگر کیا گیا ہے تاکہ انسان اپنی ذاتی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ سماج کا ایک ذمّے دار فرد بھی بن سکے۔ اس کے لیے بنیادی سوالوں کو اُٹھایا گیا ہے اور ان کے اہم نکات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کا دوسرا حصّہ ''ہندستان کی تعلیمِ جدید کے عناصر'' ہے جس کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہندستان کی جدید تعلیم کے عناصر، جدیدیت کی اساس، سائنس اور عقل پر مبنی ہیں۔ اس کی ابتدا اور اثرات جو بتدریج ہمارے ملک و سماج کے فکر و ذہن کو بدل رہے ہیں اور ساتھ ہی آئے دن ان کی مخالفت بھی ہو رہی ہے، مصنف نے مختصراً اس کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

اس حصے میں جمہوریت، جمہوریت اور تعلیم، قومیت، قومیت اور تعلیم پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ جمہوریت کا مطلب، جمہوریت کے اقسام، اس کا اخلاقی تصوّر اور ہندستان میں ذات پات، دیہاتی پسماندگی، ناکافی پیداوار وغیرہ جیسے مختلف مسائل کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ ''جمہوریت اور تعلیم'' میں جمہوری نظام میں تعلیم کے مواقع اور اقتصادی ترقی کی غرض سے تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم و تربیت کے رول کا ذکر کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اسکول اور مدارس کے نظم و ضبط کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آزادی کے مفہوم و معنی کے ساتھ اس کی ذمّے داری اور تعلیم برائے آزادی کے ساتھ ساتھ تعلیم کے مختلف مدارج کا جن میں ابتدائی تعلیم، ثانوی تعلیم اور یونیورسٹی کی تعلیم شامل ہیں، جائزہ لیا گیا ہے۔ قومیت کے تحت قوم کی تعریف، اقوام عالم کا ارتقا، قوم پرستی اور ہندستان میں قوم پرستی کا مرحلہ بہ مرحلہ ارتقا، ہندستان کے باشندے ایک قوم ہیں جیسے اہم سوالات زیرِ بحث آئے ہیں اور ساتھ ہی قوم پرستی کے منفی و مثبت اثرات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ''قومیت اور تعلیم'' میں تعلیم پر قوم پرستی کی چھاپ اور قوم پرستی کے مختلف عناصر کو بیان کیا گیا ہے نیز قومی یکجہتی کا تصوّر، اس کا فروغ، بین الاقوامی افہام و تفہیم اور اس کی سمجھ کے لیے تعلیم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ ''اجتماعیت اور منصوبہ'' حصّۂ دوم کا آخری باب ہے۔ اس میں منصوبہ بندی کی وضاحت کے ساتھ جدید ہندستان کی تعمیر و تشکیل میں منصوبہ بندی کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتھ ہی منصوبہ بندی کے اغراض و مقاصد اور اس کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مصنف نے اقتصادی ترقی میں تعلیم کے رول اور تعلیمی منصوبہ بندی کی بھی وضاحت کی ہے۔

کتاب کا تیسرا اور آخری حصہ تعلیم کی مختلف ایجنسیوں سے متعلق ہے۔ سب سے پہلے مصنف نے بے ضابطہ اور باضابطہ تعلیم کی الگ الگ وضاحت کی ہے۔ کسی بھی سماج یا معاشرے کی تعمیر میں تعلیم کی اہمیت مسلّم ہے اور یہ منظم تعلیم اسکول ہی مہیا کراتا ہے۔ چنانچہ مصنف نے اسکول کو منظم تعلیم کا سب سے بڑا ادارہ بتایا ہے اور ایک رسمی ایجنسی کی حیثیت سے اسکول کا جائزہ لیا ہے۔ ''تہذیب کی منتقلی میں اسکول کا رول'' میں اسکول کے فرائض اور اسکول کی سماجی حیثیت پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ بعد ازاں تعلیم کی تین غیر رسمی ایجنسیوں کا جائزہ لیا ہے جو انسان کی شخصیت کو بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ ایجنسیاں گھر یا

خاندان، مذہب اور سماج یا معاشرہ ہیں۔ یہ تینوں غیر رسمی ادارے لازم اور ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ یہ کتاب تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے تمام افراد کے لیے نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ امید ہے کہ اہلِ ذوق حضرات خصوصاً اساتذہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ قومی کونسل اس کی اشاعت کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے۔

•

اردو کے ادبی معرکے/ ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

صفحات: 448، قیمت: -/85 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1 آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: محمد ہادی رہبر

شعرا کے درمیان نوک جھونک کا سلسلہ بہت پرانا ہے اور یہ روایت ہر زبان میں ملتی ہے۔ جس کی بنیاد کبھی اسکولوں کے اختلاف، کبھی علاقائی عصبیت تو کبھی گروہی تعصبات پر رہی ہے۔ یہ عصبیت بذات خود کوئی اچھی چیز نہیں لیکن دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اہلِ علم کا اختلاف علم و ادب کے فروغ میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ شعرا کی نوک جھونک بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ زبان و بیان کی بہت سی نزاکتیں اجاگر ہوتی ہیں، دوسرے یہ کہ عام حلقے کی دلچسپی کا سامان بھی مہیا ہوتا ہے۔ فریقین کے حواریوں میں کچھ ایسے لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جن کا داخلہ صرف سروں کی گنتی کے لیے ہوتا ہے لیکن کبھی کبھی تو یہ اہل قلم کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اردو میں یہ سلسلہ ابتدا ہی سے چلا آرہا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان اپنے ابتدائی مراحل ہی میں تھی کہ اس سے وابستہ تہذیب زوال کی طرف مائل ہوگئی۔

حکمرانوں کا سیاسی اثر و رسوخ سمٹنے لگا تو تفریحی مشاغل بڑھ گئے۔ شعرا شاہی دربار یا امرا و رؤسا تک رسائی حاصل کرنے کی فکر میں رہے۔ ظاہر ہے دربار شاہی میں ہر ایک کی رسائی ممکن نہ تھی۔ اس لیے اس میدان میں زور آزمائی کا سلسلہ شروع ہوا جس کو تعصبات نے مزید ہوا دی۔ ان تعصبات کی بنیادیں گوناگوں قسم کی تھیں ایک تو یہی کہ زبان اردو پر دلی والوں کا اجارہ تھا اور وہ اپنے سوا کسی دوسرے علاقے کی زبان کو ٹکسالی زبان کا درجہ دینے پر آمادہ نہ تھے۔ چنانچہ وہ لوگ جو کسی دوسرے مرکز سے تعلق رکھتے تھے، انھوں نے اپنا تشخص قائم کرنے کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے۔ دوسری طرف وہ لوگ جو کسی نہ کسی دربار سے وابستہ تھے، ان کے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے جذبے نے معرکہ آرائیوں کو ہوا دی۔ جس کی سب سے نمایاں مثال مصحفی اور انشا کا معرکہ ہے جو دربار سے نکل کے سڑکوں پر آگیا اور طرفین کو رسوا کرنے کے لیے بھانڈوں تک کا سہارا لیا گیا۔

آج کے تناظر میں ان معرکہ آرائیوں کا مطالعہ ادب کے قاری کے لیے دُہری معنویت کا حامل ہے ایک تو یہ کہ اس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری شاعری کن کن مراحل سے گزری ہے دوسرے یہ کہ اس سے ہم اپنے اسلاف کی تاریخ اور اخلاقیات بھی مرتب کر سکتے ہیں۔ اردو میں اس سلسلے میں جتنا کام ہونا چاہیے تھا نہیں ہو سکا۔ کلیم الدین احمد نے اپنے چند مقالوں میں ان نقوش کو سمیٹنے کی کوشش کی تھی، ان کے بعد ڈاکٹر محمد یعقوب عامر نے اس طرف توجہ کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں انشا سے غالب تک کے معرکوں کا حال لکھا گیا ہے جس میں مصحفی و انشا اور مصحفی و شاگردانِ سودا کی چشمک پر دو ابواب قائم کیے گئے ہیں۔ انشا پر چار جن میں انشا اور عظیم، انشا اور فائق، انشا اور قتیل، انشا اور راغب کے معرکوں کا حال مفصل لکھا گیا ہے۔ انشا ہماری زبان کے ان شاعروں میں ہیں جن کے معرکے سب سے زیادہ اور غالباً سب سے طولانی بھی ہیں۔ ان معرکوں میں انشا کی شخصیت کے جو خدوخال ابھرتے ہیں، ان سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انشا جیسا ذہین اور طباع شخص غالباً اردو میں کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ لیکن یہ ہماری اور اردو زبان دونوں کا المیہ ہے کہ انشا کی بے پایاں ذکاوتِ علمی ان معرکوں کی نذر ہوگئی۔ ان سے بجا طور پر جن کاموں کی توقع کی جاسکتی تھی، وہ سرانجام نہ پاسکے۔ گویا انشا کے معرکے اہل نظر کے لیے عبرت کا سامان بھی ہیں کہ کسی کی ذہانت جب غلط سمتوں میں جانکلتی ہے تو اس کی شخصیت کی تعمیر اس نہج اور معیار کی نہیں ہو پاتی جو کہ ہونی چاہیے تھی۔

قتیل کے دوسرے معرکے بھی ایک باضابطہ عنوان کے تحت رکھے گئے ہیں اس کے بعد جرأت و نوا، آتش و ناسخ، اور انیس و دبیر، کے معرکوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ان میں ناسخ و آتش اور انیس و دبیر کا معرکہ تھوڑی اور تفصیل چاہتا تھا۔

ایک باب نصیر اور ذوق کے معرکے پر مبنی ہے، جس میں کوئی خاص بات نہیں جب کہ ایک اور باب غالب کے معرکوں پر مبنی ہے جو استاد ذوق، حامیانِ قتیل اور حامیانِ برہان قاطع وغیرہ سے ہوئے۔ ان معرکوں کی افادیت سب سے زیادہ ہے کہ ان سے نہ صرف شاعری بلکہ فرہنگ نویسی کے اصولوں کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ ایک بات البتہ کھٹکتی ہے کہ غالب کے اعتراضات جو قتیل اور حامیانِ قتیل اور صاحب برہان قاطع وغیرہ پر تھے، ان پر کافی کام ہو چکا ہے۔ ان میں، بہت سے اعتراضات بیجا بھی ثابت ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر یعقوب عامر تھوڑی سی کوشش کرتے تو حواشی میں ان کی اصل کیفیت کو ظاہر کر سکتے تھے۔

پانچواں باب نساخ اور اہل لکھنؤ، شاگردانِ نساخ و عالی کے معرکوں پر مبنی ہے۔ اس سے لکھنؤ میں اہل زبان کی جو ترجیحات تھیں، انھیں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ تمام معرکوں کے احوال و کوائف کو مولف نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ جمع کیا ہے۔ ایک بات البتہ کھٹکتی ہے کہ جہاں جہاں ہجو میں گندے الفاظ (گالیاں وغیرہ) کا استعمال کیا گیا ہے، مؤلف نے انھیں حذف کر کے خالی جگہیں چھوڑ دی

ہیں۔ یہ منی تنقید کے اصولوں کے منافی ہے۔ یوں بھی ادب کی دنیا میں ناگفتنی کچھ بھی نہیں، لہٰذا مولف کو انھیں من وعن نقل کرنا چاہیے تھا۔ نئی نسل گذشتگان کی لطافتوں کے ساتھ کثافتوں کی بھی حق دار ہوتی ہے اور اس پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوت ممیزہ سے کام لے کر صالح عناصر چن لے۔ بہرحال مؤلف کی یہ کوشش قابل تحسین ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی مبارکباد کی مستحق ہے کہ اچھی کتابوں کے قحط کے دور میں وہ معیاری، علمی، ادبی اور فنی کتابیں شائع کر رہی ہے۔

•

سہ ماہی فکر و تحقیق، جلد-7، شمارہ-3

(جولائی تا ستمبر 2004)

صفحات: 168، قیمت: -/25 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-1
آر. کے. پورم، نئی دہلی-66

مبصر: رئیس احمد

اس شمارے کا پہلا مضمون 'مبادیات تحقیق' ہے، جس میں پروفیسر حنیف نقوی نے نہ صرف فن تحقیق اور تحقیق کے طریقۂ کار پر سیر حاصل بحث کی ہے بلکہ محققین ادب کے لیے ایسی کارآمد اور پتے کی باتیں کہی ہیں جن سے کار تحقیق کی انجام دہی میں روگردانی غلط نتائج تک بھی لے جا سکتی ہے۔ پروفیسر موصوف کو علمی و ادبی تحقیق سے خاص شغف رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ ادبی حقائق کی بازیافت میں صاحب مضمون کے پیش کردہ نتائج کو اپنے استدلالی طرز بیان کے باعث پایۂ استناد حاصل ہے۔ زیر نظر مضمون میں بھی پروفیسر نقوی نے ـــ ''اصلاح زبان کی تحریک اور اس کے علم بردار''، ''مرزا اسداللہ خاں غالب اور ان کے تخلص''، ''مرزا حاتم علی بیگ مہر و مرزا رجب علی بیگ سرور اور ان کی جائے پیدائش''، ''احمد حسین سحر کاکوروی اور بہار بے خزاں''، ''پروفیسر محمد حسن اور مفتاح التواریخ مصنفہ طامس ولیم بیل''، ''دریائے لطافت اور مولوی عبدالحق''، ''فسانۂ عبرت اور پروفیسر مسعود حسن رضوی'' اور ''ڈاکٹر محمد شفیع و آغا حشر کاشمیری'' جیسے پیچیدہ اور تحقیق طلب موضوعات پر مفصل و مدلل بحث کی ہے، ساتھ ہی معلوم حقائق اور دستیاب بنیادی ماخذ کی روشنی میں واقعیت تک پہنچنے کی حتی الوسع سعی کی ہے۔ علاوہ ازیں حقائق کی یافت و بازیافت میں ثانوی ماخذ کو یکسر نظر انداز کرنے کی تلقین کی ہے۔ صاحب مضمون نے تحقیق و تنقید کے مستحکم اور اٹوٹ رشتے کو بھی موضوع بنایا ہے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ہم عصر ادبا و شعرا کی معرکہ آرائیوں کی ایک طویل روایت رہی ہے اور یہ ''ادبی معرکے'' اردو ادب کی تاریخ کا ایک اہم باب تسلیم کیے جاتے ہیں، چونکہ ان کے مطالعے سے بعض ایسے شواہد منظر عام پر آ جاتے ہیں جن تک دوسرے وسائل سے ادب کے عام قارئین کی رسائی ممکن نہیں، یہی وجہ ہے کہ یہ ادبی معرکے محققین ادب کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ اس شمارے کے دوسرے مضمون میں پروفیسر اکبر حیدری کشمیری نے ''معرکۂ دیا نرائن نگم و پیارے لال شاکر'' کو موضوع بنایا ہے۔ مضمون کے مطالعے سے پیارے لال شاکر میرٹھی کی شاعرانہ حیثیت مشکوک ٹھہرتی ہے اور مختلف حوالوں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں پیارے لال شاکر کو جن شعری تخلیقات کی بدولت شاعر تسلیم کیا جاتا ہے، دراصل وہ جملہ تخلیقات درگا سہائے سرور جہان آبادی کی فکر کا نتیجہ ہیں۔ اکبر حیدری کشمیری نے سرور مرحوم کے نام پیارے لال شاکر میرٹھی کے جو خطوط (جن کی تعداد دس ہے) نقل کیے ہیں، وہ بھی اس قیاس کی تائید کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں منشی پریم چند، منشی دیا نرائن نگم، نوبت رائے نظر، برق دہلوی اور درگا سہائے سرور جہان آبادی کے بیانات اور اس وقت کے ادبی رسالوں ''زمانہ''، ''ادیب'' اور ''العصر'' کے بعض اقتباسات سے بھی اس خیال کو تقویت ملتی ہے۔

سید حسن عباس نے ایران میں اپنے قیام کے دوران وہاں کے بعض اہم کتب خانوں میں موجود بہت سے نایاب و کم یاب اردو مخطوطات تک رسائی حاصل کی تھی، جن کی تفصیلات کا ایک حصہ مجلّہ ''تحقیق'' (شمارہ۔ 5، جام شورو سندھ، پاکستان) میں شائع ہو چکا ہے۔ زیر نظر مضمون (ایران میں اردو مخطوطات) اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے، جس میں کل 46 اردو مخطوطات کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے، ان میں ''تاریخ ہند'' (از منشی نظام الدین) ''ترجمہ قطب شاہی'' (از ابن خاتون عاملی) ''داستان بدر منیر و بے نظیر'' (از میر حسن دہلوی) ''دیوان مومن سندھی'' (از مومن سندھی) ''شاہنامۂ ہندی'' (از مول چند ہندی) اور (مثنوی) 'پدماوت' (از ملک محمد جائسی) ادبی تحقیق کے حوالے سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مخطوطات سے دلچسپی رکھنے والے قارئین ادب کے لیے یہ مضمون ایک ادبی تحفے کے مترادف ہے۔ سید حسن عباس کو ان مخطوطات کی معلومات ایران کے جن دس کتب خانوں سے ہوئی ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

1. کتابخانۂ عمومی حضرت آیت اللہ العظمیٰ مرعشی نجفی، قم (ایران)
2. کتابخانۂ مجلس شورائے اسلامی، تہران (ایران)
3. کتابخانۂ ملک، تہران (ایران)
4. کتابخانۂ مرکزی دانش گاہ، تہران (ایران)
5. کتابخانۂ سپہ سالار، تہران (ایران)
6. کتابخانۂ آستان قدس رضوی، مشہد (ایران)
7. کتابخانۂ ملی ایران، تہران و کتابخانۂ ملی، تبریز (ایران)
8. کتابخانۂ نور بخش، تہران (ایران)
9. کتابخانۂ مسجد اعظم، قم (ایران)
10. فہرست نسخہ ہائے خطی، دفتر ہفتم، دانش گاہ تہران

مغل سلاطین سلطنتی امور کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ فنون لطیفہ اور پرورشِ لوح وقلم وتہذیبی مشاغل سے خاص شغف رکھتے تھے، شہنشاہ جہانگیر مصوری کے اعلا پائے کے پارکھ تھے اور انھیں اس فن سے خصوصی شغف تھا۔ سید محمود کاظمی نے ''تزک جہانگیری'' کے حوالے سے'' جہانگیر اور فنِ مصوری'' پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور جہانگیر کے دربار سے وابستہ جملہ مصوروں کے فنی امتیازات وکمالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

یوسف تقی نے بدرالزماں بدرکلکتوی کے اہم ناول ''احسن'' کا نہ صرف فنی اعتبار سے تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے بلکہ بنگال میں اردو زبان وادب کے بتدریج ارتقائی سفر کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے، بدرکلکتوی کا یہ ناول پہلی بار قسط وار اخبار'شحنۂ ہند' (میرٹھ) میں 24 اکتوبر 1907 سے شائع ہونا شروع ہوا اور اس کے حصۂ اوّل کی آخری قسط 16 جنوری 1908 کے شمارے میں شائع ہوئی، اس ناول کا پورا پلاٹ احسن (کہانی کا ہیرو) رابعہ (کہانی کی ہیروئن) شمس النسا بیگم اور شوکت جاہ کے اردگرد گھومتا ہے۔ ناول نگار نے فنی چابکدستی کے ساتھ ہر کردار کو اپنی شخصیت اجاگر کرنے کا پورا پورا موقع دیا ہے۔ بدرکلکتوی نے عورتوں کے مختلف کرداروں کے توسّط سے مسلمانوں کے ایسے طبقے کی تصویر کھینچی ہے جو بدلتے زمانے کے باوجود ''نوابیت'' کے خول میں بند ہیں۔ ''احسن'' میں ناول نگار کا اسلوب ناول کے فنی تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور (1907) کے ناولوں میں ''احسن'' کی ادبی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

''ترانۂ ہندی'' (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا) 1904 میں لکھا گیا تھا اور سالِ رواں (2004) میں اس کی تخلیق کو ایک صدی پوری ہوگئی ہے، سید صادق علی نے اسی پس منظر میں علامہ اقبال کی حب الوطنی کو موضوع بنایا ہے، اگرچہ اس پر بارہا ماہر تصدیق ثبت کی جاچکی ہے۔ اس سے قطع نظر یہ مضمون اپنے موضوع کا پورا احاطہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی صاحب مضمون نے علامہ اقبال کی شاعرانہ اور فلسفیانہ اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے مضمون کے آخر میں ''ترانۂ ہندی'' کے ادبی وفنی محاسن اور معانی ومطالب پر روشنی ڈالی ہے۔

''اردو خاکہ نگاری'' ایک تجزیاتی اور تحقیقی مطالعہ ہے، جس میں شہاب ظفر اعظمی نے لفظ'' خاکہ'' کے لغوی واصطلاحی معنی سے لے کر اس صنف کے تاریخی و ارتقائی سفر پر بھرپور روشنی ڈالی ہے، ان کے مطابق اردو میں بطور صنف صحیح طور پر خاکہ نگاری کو متعارف کرانے کا سہرا مرزا فرحت اللہ بیگ کے سر ہے جن کے دو طویل مضامین'' نذیر احمد کی کہانی — کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' (1927) اور ''وَلی کا یادگار مشاعرہ'' (1928) خاکہ نگاری کی اوّلین اور عمدہ مثالیں ہیں، بعد ازاں مولوی عبدالحق، رشید احمد صدیقی، آغا حیدر حسن دہلوی، ڈاکٹر سید عابد حسین، فکر تونسوی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، شوکت تھانوی، ڈاکٹر اعجاز حسین، شاہد احمد دہلوی، علی جواد زیدی اور مجتبیٰ حسین سے لے کر مظہر امام، ڈاکٹر عزیز اندوری، انور ظہیر خاں، سلیمان اطہر جاوید، کشمیری لال ذاکر، حامد اللہ ندوی اور ندا فاضلی کے خاکوں کے مجموعوں کو تبصراتی انداز میں متعارف کرایا ہے۔

رشید قریشی نے مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال کے تاریخی، سیاسی اور سماجی تناظر میں'' ادیبوں کی علاقائی حرکت پذیری'' کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں انھوں نے ایسے تمام ادیبوں اور شاعروں کو شامل کیا ہے جو فکرِ معاش اور ملازمت کے سلسلے میں ملک کے دیگر مقامات سے بھوپال تشریف لائے، ساتھ ہی بھوپال کے ان ادبا وشعرا کا بھی ذکر ہے جو بھوپال سے ملک کے دیگر شہروں میں گئے اور وہاں اپنی شخصیت کا ایک نقش چھوڑا۔ رشید قریشی نے ان ادبی شخصیات کی علاقائی حرکت پذیری کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ ان کے مختصراً احوال وکوائف اور ان کی ادبی فتوحات سے بھی واقفیت ہوجاتی ہے۔ ان شخصیات میں حضرت شاہ رؤف احمد رافت، شاہ عبدالقیوم، منشی جمال الدین، مولوی صدیق حسن خاں، عبدالباقی وفا، عبدالحلیم ذکا صدیقی، سہا مجددی، عبدالرزاق کانپوری، عبدالرحمٰن بجنوری، ڈاکٹر عابد حسین، سید سلیمان ندوی، شفا گوالیاری، ارشد صدیقی ساگری، صہبا لکھنوی، عمیق حنفی، جاں نثار اختر، گیان چند جین، ابومحمد سحر، سلیم حامد رضوی، حنیف نقوی، شفیقہ فرحت اور عبدالقوی دسنوی بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ صاحب مضمون کے منفرد طرز بیان نے قارئین کے لیے سامانِ دلچسپی فراہم کردیا ہے، علاوہ ازیں اس مضمون کے مطالعے سے شہر بھوپال کے تاریخی، سیاسی اور جغرافیائی احوال پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

آخری مضمون میں عاصم شہنواز شبلی نے'' مغربی بنگال میں اردو غزل'' (اکتسابات اور امکانات) پر تنقیدی زاویۂ نگاہ سے بحث کی ہے اور مغربی بنگال میں اردو غزل کے فکری وفنی محاسن وامتیازات کو مع دلائل تاریخی پس منظر میں پیش کیا ہے، جس کی بنا پر یہ تجزیاتی اور تنقیدی مطالعہ غزل کی تنقید کے لوازمات کی پاسداری کی بہترین مثال کہا جاسکتا ہے۔ اس مضمون میں علامہ رضا علی وحشت کلکتوی سے لے کر عہدِ حاضر تک کے جملہ نمائندہ شعرا کو شامل کیا گیا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایسے علمی وتحقیقی جریدے کی اشاعت پر قابلِ صد مبارکباد ہے۔

•

عمرِ گزشتہ کا حساب/مخمور سعیدی

صفحات (جلد اوّل۔ غزلیں): 389، (جلد دوم۔ نظمیں): 330،

قیمت:-/600 روپے

ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، 9 گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: فیروز عالم

''عمرِ گزشتہ کا حساب'' عہدِ حاضر کے معتبر شاعر مخمور سعیدی کے کلام کا ایک جامع انتخاب ہے۔ جس کی پہلی جلد میں غزلیں اور دوسری جلد میں نظمیں جمع کردی گئی ہیں۔ اس کلیات میں مخمور صاحب کے شعری مجموعوں گفتنی، سیہ بر سفید، آواز

کا جسم، واحد متکلم، آتے جاتے لمحوں کی صدا، بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا، اور دیوار و در کے درمیاں کا منتخب شعری سرمایہ مجتمع کر دیا گیا ہے۔ ابھی حال ہی میں موصوف کا ایک اور شعری مجموعہ ''راستا اور میں'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ شاید ''عمرِ گزشتہ کا حساب'' کے اگلے ایڈیشن میں اس مجموعے کی تخلیقات بھی شامل کر لی جائیں۔

بڑا شاعر وہ ہوتا ہے جو اجتماعی احساسات، انفرادی تجربات اور نجی جذبات کو اس خوش اسلوبی سے شعر میں ڈھالتا ہے کہ بات دل سے نکل کر دل میں بیٹھ جاتی ہے، اور ہر قاری کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے دل کی بات شاعر نے کہہ دی ہے۔ میر اور غالب کے کلام کی فکری اور فنی خصوصیات سے قطع نظر ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ سب کو اپیل کرتا ہے۔ جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر پیش کرنے کا جو ہنر میر کی شاعری میں ملتا ہے اور ہزار غم کے باوجود مسکرانے کا حوصلہ اور جیے جانے کی جو للک غالب کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے، یہ دونوں خوبیاں مخمور سعیدی کی شاعری میں بیک وقت موجود ہیں۔ مخمور سعیدی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی نظموں اور غزلوں میں کلاسیکی لب و لہجے میں جدید موضوعات و مسائل کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ تنہائی، گئے دنوں کی یاد، افسردگی، حالات کی ستم ظریفی، مقتدر طبقے کا ظلم و جبر، ہجرت کا کرب، عام آدمی کی پریشانیاں، بین الاقوامی سطح پر امیر ممالک کے ذریعے غریب اور کمزور ممالک کا استحصال، فرقہ وارانہ فسادات وغیرہ مختلف موضوعات ہیں جن سے مخمور سعیدی کی شاعری کا خمیر تیار ہوا ہے۔

مخمور سعیدی کی شاعری میں ماضی کی یادیں ایک Powerful موضوع کے طور پر ابھرتی ہیں۔ ان یادوں کی مختلف sheds ہیں جو ان کی نظموں اور غزلوں میں ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں۔ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

دلِ فسردہ میں لرزاں ترے خیال کی لو
بجھے چراغ میں ہو جیسے روشنی اے دوست

مٹ چلیں، عمرِ تمنا کی وہ یادیں، لیکن
اک کسک سی ہے کہ ہستی میں ڈھلی جاتی ہے

کیا قیامت ہے، کہ دل سے مرے، بیگانہ صفت
قافلے اب تیری یادوں کے گزر جاتے ہیں

آ ہی نکلا ہوں جو یادوں کے کھنڈر تک مخمور
بھولے بسروں سے ملاقات بھی کرتا جاؤں

یادوں کے قافلے بھی مجھ سے بچھڑ چکے ہیں
سنسان راستوں سے تنہا گزر رہا ہوں

ہر نئی رُت میں ہم افسردہ و دلگیر رہے
یاد گزرے ہوئے موسم کی جوانی آئی

دھندلا ہے بہت یاد کا آئینہ پھر اس کو
بھولے ہوئے چہروں کے تصور سے نکھاریں

یادوں کی کسک، تنہائی کا کرب مخمور سعیدی کی شاعری میں ایک اہم موضوع بن کر ابھرا ہے۔ اپنا گھر بار چھوڑ کر دیارِ غیر میں ٹھکانہ بنانے والوں کی اکثریت تنہائی کی شکار ہے اور عصرِ حاضر کے تقریباً تمام شعرا کے یہاں اس موضوع پر اشعار ملتے ہیں لیکن مخمور سعیدی کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف اپنی تنہائی سے مغموم نہیں ہیں، دوسروں کی تنہائی بھی ان کے دل کو کچوکے لگاتی ہے۔ کہتے ہیں ؎

اپنے اپنے دکھوں کی دنیا میں
میں بھی تنہا ہوں وہ بھی تنہا ہے

موجودہ عہد میں عام آدمی کی زندگی جن مسائل سے دوچار ہے اور ہر قدم پر اس کو جس طرح استحصال کا شکار ہونا پڑتا ہے، ہر جگہ ظلم و تشدد کا بازار گرم ہے اور عام آدمی اس میں کیڑے مکوڑے کی طرح مارا جا رہا ہے، یہ صورتِ حال مخمور سعیدی کی غزلوں میں جا بجا نظر آتی ہے۔

یہ پرانے یگوں کی کہانی نہیں، میرے اپنے زمانے کی تاریخ ہے
دن دہاڑے لٹیں سیکڑوں بستیاں، شہر کے شہر زندہ جلائے گئے

یہ سچویشن انسان کو ہجرت پر مجبور کرتی ہے۔

لہو لہو سا یہ منظر، یہاں سے بھاگ چلو
اب اپنی لاش اٹھا کر یہاں سے بھاگ چلو
ہوا میں نور نہ نکہت نہ رنگ، صرف دھواں
فضا ہے کتنی مکدر، یہاں سے بھاگ چلو

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دنیا کے کسی کونے میں سکون و اطمینان میسر ہے؟ آج ہر جگہ انتشار و خلفشار اور نفسی نفسی کا عالم ہے۔ کہیں بڑے ممالک چھوٹے ممالک پر قبضہ جما رہے ہیں تو کہیں طاقتور انسان کمزور انسان کو دبا رہا ہے۔ حالت یہ ہے کہ

ہر قدم پر ساتھ ہیں اب موت کی پرچھائیاں
زندگی! تیری طلب میں ہم کہاں تک آ گئے

زندگی کتنی بے سہارا ہے
موت ڈھارس نہ دے تو مر جائیں

مخمور سعیدی کی غزلوں کی خوبی یہ ہے کہ ان میں عصرِ حاضر کی انسانی زندگی کی تمام sheds کی عکاسی ہوئی ہے۔ شاعر کے اپنے تجربات و محسوسات اور موجودہ دور کے عام انسان کے سکھ اور دکھ کی عکاسی ان غزلوں میں بہترین انداز میں ہوئی ہے۔

غزلوں کی طرح نظموں میں بھی مخمور سعیدی نے انھی موضوعات کو منتخب کیا ہے۔ ان میں عصرِ حاضر کی افراتفری، فرقہ وارانہ فسادات، یک قطبی دنیا میں امریکہ اور اس کے حلیفوں کی جارحیت، عام آدمی کی بے بسی، تنہائی، ماضی کی یادیں، گھر بار چھوڑنے کا دکھ، یہ اور اس طرح کے تمام موضوعات مخمور صاحب کی نظموں کا عنوان بنے ہیں لیکن شاعر کا رویہ قنوطیت کے بجائے رجائیت کا ہے اور وہ لاکھ پریشانیوں کے باوجود حالات کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کرتے ہیں۔

نظم 'تمہید کے فرشتے' میں مخالف ماحول میں بھی جینے کا عزم و حوصلہ نظر آتا ہے

قید در ماندگیِ دل ہو، کہ جبرِ ماحول
عزمِ انساں کو بہرحال جواں رکھا ہے
ہر قدم پر تھیں حوادث کی چٹانیں لیکن
ہم نے تاریخ کے دھارے کو رواں رکھا ہے

مخمور سعیدی کا شعری مسلک ترقی پسندی اور جدیدیت سے ماورا ہے۔ وہ کسی خاص نظریے کی پابندی کے بجائے فکر و خیال کی آزادی پر زور دیتے ہیں۔ نظم ''چو سرو باش کہ ہست از ہوائے خود رقاص'' میں کہتے ہیں ؎

نظامِ زیست کی تشکیلِ تازہ تر کے لیے
بری نہیں ہے نظامِ کہن کی بربادی
ہر اس نظام سے لیکن ستیزہ کار ہوں میں
جو مجھ سے چھین لے فکر و نظر کی آزادی

''اے وادیِ کشمیر'' میں منظر نگاری کے خوبصورت مرقعے پیش کیے گئے ہیں۔

بہتی ہوئی ندیوں میں یہ نغموں کا تلاطم
بڑھتی ہوئی موجوں کا یہ پرکیف ترنم
گاتی ہوئی جل پریوں کا یہ شوخ تکلم
گوشِ دلِ مشتاق میں بجتے ہیں مزامیر
اے وادیِ کشمیر

اس نظم میں کشمیر کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے ؎

اے دخترِ گلبدنِ ارضِ ہمالہ
ٹیکا تیرا مسجد ہے تو جھومر ہے شوالہ
دونوں سے تیرے حسن کا آہنگ دوبالا
ناقوس کی آواز ہو یا نعرۂ تکبیر
اے وادیِ کشمیر

افسوس کہ آج کشمیر جنت نشاں چنار سے لالہ زار نہیں، انسانی غارتگری سے لہولہان ہے اور وہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی جو کشمیر کی شناخت تھی، آج اسے گھن لگ گیا ہے۔ وادیِ کشمیر میں پچھلے چودہ پندرہ برسوں سے آگ اور خون کا جو رقصِ برہنہ جاری ہے اس کے آثار شاعر نے بہت پہلے محسوس کر لیے تھے۔ چنانچہ اس نظم میں آنے والے دنوں سے متعلق خدشے کا اظہار شاعر نے ان لفظوں میں کیا ہے ؎

اے وادیِ کشمیر مجھے پھر وہی ڈر ہے
اک شعلہ خو عفریت کی پھر تجھ پہ نظر ہے
پھر تیری بہاروں میں وہی رقصِ شرر ہے
کر لے نہ کوئی دیوِ خزاں پھر تیری تسخیر
اے وادیِ کشمیر

رشتوں کے ٹوٹنے کا عمل بڑا جاں گسل ہوتا ہے۔ مخمور صاحب کی غزلوں اور نظموں میں اکثر اس موضوع پر اشعار ملتے ہیں۔ ''شمع بجھتی ہے تو'' کا ایک بند دیکھیے:

کیا ہے تارِ رگِ جاں سے استوار جنھیں
خبر نہ تھی کہ وہ رشتے بھی ٹوٹ جائیں گے
بھرے جہاں میں یہ محسوس کر رہا ہوں میں
کہ ڈس رہی ہے مجھے ہولناک تنہائی

ایک شاعر اور ادیب سماج کا ہمسفر بھی ہوتا ہے اور راہ نما بھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب جب دنیا میں ظلم و ستم کی آندھیاں چلی ہیں، شاعروں اور ادیبوں نے سب سے پہلے ان کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ فرانسیسی انقلاب ہو یا روسی انقلاب، دو عظیم جنگیں ہوں یا ہندستان کی جدوجہدِ آزادی، شعرا و ادبا نے ان سب میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ انسان دوستی ان کا مسلک ہے اور انسانیت مذہب، علاقہ، رنگ اور نسل سے قطع نظر یہ صرف دشمنِ انسانیت کے پیکار ہیں۔ مخمور صاحب اپنی نظم ''دودمانِ بشر'' میں لکھتے ہیں ؎

کوئی حبشی ہو یا فرنگی ہو
وہ بہرحال ابنِ آدم ہے
اس کی دنیا ہماری دنیا ہے
اس کا عالم ہمارا عالم ہے

اور نظم کے آخر میں کہتے ہیں ؎

نسل و قوم و وطن کی زنجیریں
روح کو قید کر نہیں سکتیں
آدمیت کے سادہ خاکے میں
رنگِ تفریق بھر نہیں سکتیں

نظم ''کبھی کبھی دل یہ چاہتا ہے'' میں انسانی خواہشات اور ان کے انجام کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کا آخری شعر پوری نظم کا لب لباب ہے ؎

کبھی کبھی دل یہ چاہتا ہے
مگر یہ دل کیا! یہ خواہشیں کیا!!

''لفظوں کا المیہ'' میں قدیم اقدار کی پامالی اور جدید اقدار کے ذریعے انھیں بے دخل کیے جانے کی صورتِ حال منعکس کی گئی ہے۔ آج پرانی اقدار کی پروردہ نسل جدید اقدار سے ہم آہنگ نہیں ہو پا رہی ہے اور وہ اپنی قدیم اقدار کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

کسی نے سوچا نہیں ہے شاید مگر میں اکثر یہ سوچتا ہوں
پرانے لفظوں کے ساتھ ہی اک پرانی دنیا بھی کھو گئی ہے
خموشیوں کے سیاہ زنداں میں جاکے روپوش ہو گئی ہے

مخمور سعیدی نے اگرچہ تجربے سے گریز کیا ہے اور کلاسیکی لہجے میں ہی اشعار کہے ہیں لیکن بعض اوقات انھوں نے نئی تراکیب بھی گڑھی ہیں اور اس سے اپنے کلام کی معنویت میں اضافہ کیا ہے۔ ''جاں کاہ تسلسل'' کا یہ شعر دیکھیے ؎

ہر صبح وہی خون میں لتھڑا ہوا سورج
کرنوں کی صلیبوں پہ لٹکتا نظر آئے

''خون میں لتھڑا سورج'' اور ''کرنوں کی صلیب'' جیسی تراکیب انوکھی بھی

ہیں، تازہ بھی اور معنی خیز بھی۔ بیسویں صدی کے نصف آخر کے شاعروں میں صرف فیض ہیں جن کی تراکیب میں اتنی تازگی اور معنی خیزی نظر آتی ہے جو قاری کو مسحور کرلے۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

کس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تیری یاد نے ہاتھ

''جاں کاہ تسلسل'' میں موجودہ دور کے انسان کی بے کیف اور بے بس زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اسی صورتِ حال سے متاثر ہوکر فراق نے کہا تھا ۔

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہوگئی ہے

ایک اور شاعر کے مطابق ۔

ایک سی بے رنگ صبحیں، ایک سی بے رنگ شام
لے رہی ہے زندگی، یہ مجھ سے کیسا انتقام

مخمور سعیدی بھی ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہیں لیکن طرزِ ادا دیکھیے، اور خوشی کے ساتھ ساتھ غم بھی اپنانے کا حوصلہ ملاحظہ فرمائیے ۔

ہاں کوئی نیا غم، کوئی نادیدہ مسرت
کیا چیز ہے وہ جس کی تمنا میں جیا جائے؟

مخمور سعیدی کو ماضی اور اس کی اقدار عزیز ہیں اور وہ جو کھو گیا اس کا درد ان کی اکثر نظموں میں نمایاں ہے۔ ''شام کا پھیرا'' بھی ایسی ہی ایک نظم ہے۔

موجودہ دور کی تیز رو اور بھاگ دوڑ والی زندگی نے نہ صرف انسان کا سکون چھین لیا ہے بلکہ اسے بے سمتی بھی دی ہے۔ نظم ''پڑاؤ'' کے دو اشعار ملاحظہ فرمائیے:

یہ روز و شب کی مسافت، یہ زندگی کا سفر
یہ تیز دوڑتے لمحے، لپکتے شام و سحر
نہ راستوں کا تعین نہ منزلوں کی خبر
غبار بن کے اڑا ہر نشانِ راہ گزر

موجودہ دور میں غمِ روزگار نے ہر انسان کو غریب الوطن بننے پر مجبور کردیا ہے۔ گاؤں اور قصبوں سے بڑی تعداد میں لوگ شہر آتے ہیں کہ ایک اچھی زندگی جی سکیں۔ پیسہ کما کر اپنی اور اپنے گھر والوں کی آرزوؤں کی تکمیل کرسکیں۔ گاؤں سے شہروں کی طرف مراجعت کے اس رجحان نے نئے مسائل پیدا کیے ہیں جن میں سب سے بڑا مسئلہ انسان کی تنہائی کا ہے۔ اسلم پرویز کا یہ شعر دیکھیے ۔

سونے پن سے گاؤں کے بھاگے تھے ہم
ڈھو رہے ہیں شہر میں تنہائیاں

مخمور سعیدی کی نظموں میں اس پوری صورتِ حال کی بڑی حقیقی عکاسی ملتی ہے۔ ''گھر'' میں ایک ایسے آدمی کی تصویر پیش کی گئی ہے جو مدتوں بعد اپنے گھر واپس آیا ہے لیکن اب اس گھر میں ابابیلوں کا بسیرا ہے۔ گاؤں میں کوئی دوست نہیں جو اسے پہچان سکے، اس کی خیر خبر پوچھ سکے کہ اتنے دنوں تک وہ کہاں رہا، کیا کرتا رہا۔ گھر میں کوئی ایسا نہیں جو اس سے سوغات کی فرمائش کرسکے۔ حد تو یہ ہے کہ ۔

تھا جن آنکھوں کو تمھاری واپسی کا انتظار
اب وہ خوابیدہ کسی گمنام ویرانے میں ہیں

یہ انتظار اتنا طویل ہوگیا کہ منتظر آنکھیں تھک کر ہمیشہ کے لیے سوگئیں اور اس بدنصیب انسان کے اتنے دنوں کی غریب الوطنی کے کرب کو مزید بڑھا گئیں کہ جن کے لیے اس نے گھر چھوڑا، اتنی تکلیفیں اٹھائیں، ان کے لیے کچھ نہ کرسکا۔ اور اب حالت یہ ہے کہ وہ در و دیوار جہاں اس کا بچپن گزرا، جہاں کسی وقت ہمیشہ چہل پہل رہتی تھی، وہ اس سے سوال کرتے ہیں ۔

پوچھتی ہے تم سے ویرانی درودیوار کی
دو گھڑی رک کر یہاں تم بھی چلے جاؤ گے کیا؟

''وہ شہراب بھی اسی جگہ ہے'' میں بھی انھی خیالات کا اظہار ملتا ہے۔

''بسر ہوتے ہوئے دکھ کا ایک دن'' میں موجودہ دور کے عام آدمی کی تصویر پیش کی گئی ہے جو لمحہ لمحہ مرتا ہے۔۔۔ کبھی طنز، کبھی ترحم اور کبھی جھنجھلاہٹ کا شکار ہوتا ہے اور گھر آکر جیسے قبر میں دفن ہوجاتا ہے۔

مخمور صاحب کی نظموں اور غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر شمس الرحمان فاروقی نے بجا لکھا ہے کہ ''مخمور سعیدی کی نظم میں اب وہ ارتکاز، کم گوئی میں کثیر المعنویت اور شدتِ احساس کے ساتھ ساتھ بالواسطگی نظر آنے لگی ہے جو جدید نظم کو گزشتہ نسل کی نظم سے الگ کرتی ہے۔ ...... غزل میں مخمور سعیدی اپنی پوری تخلیقی قوت صرف کردیتے ہیں، ان کی غزل نک سک سے درست تو ہوتی ہی ہے، اس میں الفاظ اور مصرعوں کا دروبست عام طور پر غیر معمولی تو ہوتا ہی ہے، بڑی بات یہ ہے کہ ''دیوار و در کے درمیاں'' کی غزلوں میں جو پختگی، آسانی سے بات کہنے کی ادا اور آزاد روانی ہے، وہ مخمور سعیدی کا اپنا کارنامہ ہے، اس پر کسی معاصر غزل گو کی پرچھائیں نظر نہیں آتی۔''

(عمرِ گزشتہ کا حساب، ص-327-329)

اس کتاب میں دو کمیاں ہیں اوّل تو یہ کہ شعری مجموعوں کے سنینِ اشاعت درج نہیں ہیں اور دوئم مجموعوں کے دیباچے شامل نہیں ہیں۔ خاص طور سے ''دیوار و در کے درمیاں'' کا دیباچہ بے حد اہم ہے۔ ترتیب و تزئین میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نے محنت کی ہے، اس لیے کتاب خوبصورت چھپی ہے اور کتابت کی غلطیاں محض دو چار جگہ ہیں۔ امید کہ شعر و سخن کے شیدائیوں کو کتاب پسند آئے گی اور وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

•

اسلحے، سکّے اور ڈاک ٹکٹ میں اسلامیات / واحد نظیر

صفحات: 304، قیمت:-/100 روپے
ناشر: وژن ہاؤس، درگاہ گھیرا، سلطان گنج، پٹنہ-6
مبصر: شگفتہ یاسمین

''اسلحے، سکّے اور ڈاک ٹکٹ میں اسلامیات'' اپنے مواد و موضوع کے اعتبار سے انفرادیت کی حامل کتاب ہے، جس میں انسان کی ابتدا اور ارتقا کے

مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اسلحہ جات، مہر و مدال اور ڈاک ٹکٹ پر اسلامی اثرات کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کے آغاز میں انھوں نے ثقافت، تہذیب اور تمدن جیسی اصطلاحات کی وضاحت کی ہے جو جداگانہ معنی و مفہوم کے حامل ہیں لیکن روزمرہ کی بول چال میں ان کا جداگانہ تشخص دھندلا گیا ہے۔

کتاب کا آغاز کرتے ہوئے ثقافت اور انسانی معاشرت کے گہرے ربط کو واضح کیا گیا ہے۔ عہد وحشت، عہد بربریت اور حجری دور کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے مصنف اس عہد میں پہنچتے ہیں جسے ہم حضرت داؤدؑ کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ اسی دور سے فلزاتی اسلحوں اور ظروف سازی کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔

کڑیوں سے کڑیاں جوڑتے ہوئے وہ ہندستانی تہذیب و ثقافت میں بھی جھانکتے ہیں جہاں اسلحہ سازی کی قدیم روایت ملتی ہے۔ اس کے بعد آلاتِ حرب و ضرب میں اسلامیات کے موضوع کا جائزہ لیتے ہوئے مختلف قسم کے ہتھیاروں کے تذکرے، ان کی تصویریں اور ان سے متعلق تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ مصنف نے نہایت باریکی کے ساتھ ان ثقافتی نوادرات کی ایک ایک جزوی تفصیل اس طرح پیش کی ہے کہ پورا منظر قاری کی نگاہوں کے سامنے یوں چلا آتا ہے جیسے وہ خود ان عجائب خانوں کی سیر کر رہا ہو۔

اسلحہ جات کے بعد مصنف نے اَعلام و نشانات میں اسلامی اثرات کو موضوع بحث بنایا ہے۔ اگرچہ مرورِ ایام نے ان تاریخی و ثقافتی باقیات کے نقوش دھندلا دیے ہیں لیکن انھوں نے زمانہ قدیم سے عہدِ رسولؐ اور پھر دورِ جدید تک کا تفصیلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے اعلام کی صنفی اور معنوی نوعیت سے قارئین کو روشناس کرایا ہے جس سے نہ صرف ان اَعلام و نشانات کی تاریخی اہمیت کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان کے پس منظر میں پنہاں اس دور کی ثقافتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی بھی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دیگر تمدنی علائم مثلاً ظروف، کلیہ، صنادیق اور طرح طرح کی آرائشی مصنوعات پر مسلمانوں کے ثقافتی ذوق، جمالیاتی حس اور اسلامی اثرات کے حوالے سے مختصر مگر جامع تبصرہ پیش کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ سکوکات اور مہر و مدال کے بغیر ادھورا ہے لہٰذا اگلے باب میں مصنف نے ان کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ تمدنی ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان کی ضرورتیں بڑھیں، اس کے فکر و عمل کا دائرہ بھی وسیع ہوتا چلا گیا اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے انسان نئی نئی ایجادات کرتا چلا گیا۔ سکے اور کرنسی نوٹ انھی اختراعات کا ایک حصہ ہیں۔

سکوں کی ابتدا و ارتقا اور نوعیت و ماہیت سے بحث کرتے ہوئے مصنف نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان سکوں میں اسلامیات کی گوناگوں جھلکیاں درحقیقت اسلامی ثقافت اور اسلامی تعلیمات ہی نہیں بلکہ عالمی ثقافت انسانی کا جزو لاینفک ہیں۔ ان تاریخی مسکوکات کی انقلابی عظمت و اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ یہ ان آفاقی صداقتوں کا مظہر ہیں جو دور، زمانے اور جغرافیائی حد بندیوں سے پرے ہیں۔

سکوں کی تاریخ میں پہلا انقلابی موڑ اس وقت آیا تھا جب اس نے استعمالی چیزوں کا لباس چھوڑ کر فلزاتی لباس پہنا اور دوسرا موڑ تب آیا جب اس نے فلزاتی لباس ترک کر کے کاغذی پیرہن اپنا لیا، جو اقوام عالم میں کرنسی نوٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ قرونِ وسطی سے دورِ حاضر تک مروج یہ [illegible] سکے اسلامی تہذیب و ثقافت کی نہایت خوبصورت جھلکیاں پیش کرتے ہیں۔

اس باب کے اختتام سے پہلے مصنف نے قارئین کی توجہ مہر و مدال کی جانب مبذول کرائی ہے جو سکہ جات اور کرنسی نوٹوں سے کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں۔ ان کا استعمال شاہانِ عرب و عجم کے درباروں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ ہر دور میں رائج یہ مہریں مختلف اقوام عالم، ان کی زبان و ثقافت اور فنی و تاریخی کڑیوں کو جوڑنے کا ذریعہ ہیں۔ مہر و تمغہ جات کا تعلق تاریخی و جغرافیائی طور پر خواہ کسی زمانے یا کسی بھی ملک سے ہو ان میں اسلامیات کی واضح جھلکیاں موجود ہیں۔

آخری باب ڈاک ٹکٹ، نقشہ جات، تصاویر، اسکیچ اور آٹوگراف میں اسلامیات کے بیان پر مشتمل ہے اور اس کا دائرہ عہدِ رسولؐ سے دورِ جدید تک دراز نظر آتا ہے۔ اس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ جس طرح اسلحہ جات، علم، سکے، کرنسی نوٹ اور مہر و مدال کی دنیا اسلامی افکار و عقائد اور اسلامی تاریخ و تہذیب کی جھلکیوں سے بے نیاز نہیں، اسی طرح ڈاک ٹکٹوں کی دنیا بھی اسلامیات کے نقوش سے آراستہ و پیراستہ ہے۔

مصنف نے ایک اچھوتے اور پیچیدہ موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ حالانکہ ان کا موضوع بحث تاریخ کے خشک ترین موضوعات میں سے ایک ہے لیکن جس خوش اسلوبی سے انھوں نے اس معرکے کو سر کیا ہے وہ قابلِ داد ہے۔

اندازِ بیان سادہ اور رواں ہے، موضوع کی خشکی کتاب کی دلچسپی پر اثر انداز نہیں ہوتی، عمومی امور پر تفصیلی بحث مصنف کے مطالعے کی وسعت اور فنی بصیرت کا ثبوت ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب آئندہ بھی اس طرز کی کتابیں منظرِ عام پر آنے کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

□□□

قلم کاروں سے گزارش ہے کہ مضامین صاف اور خوش خط روانہ فرمائیں۔

مصنف: محمد حفیظ الدین بچوں کا گوشہ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب ''مولانا روم کی کہانیاں'' سے ایک کہانی پیش کی جارہی ہے۔ اس کتاب میں بچوں کے لیے نصیحت آموز کہانیاں پیش کی گئی ہیں جن کے مطالعے سے ان میں اچھے برے کی تمیز اور ایک بہتر زندگی گزارنے کا سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔

38 صفحات کی اس کتاب کی قیمت صرف -/6.50 روپے ہے۔ کونسل اپنی کتابوں پر طلبہ اور اساتذہ کو 40% کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

ہُدہُد سے کوّے کا حَسد

حضرت سلیمانؑ پیغمبر تھے، پرندوں کی بولی جانتے تھے۔ ہر پرندہ ان کی خدمت میں رہنا عزت کی بات سمجھتا تھا۔ سب اپنے اپنے کمالات اُن پر جتاتے اور اپنے آپ کو اُن کے پاس رہنے کے لائق بتاتے۔

ہُدہُد نے اپنی باری میں حضرت کو بتایا کہ یوں تو مجھ میں جو خوبیاں ہیں وہ خیر ہیں ہی، ایک سب سے چھوٹی بات مجھ میں یہ ہے کہ میں ہوا میں اُڑ کر زمین کی ہر چیز دیکھ لیتا ہوں۔ پانی کو تو ایک نظر میں پہچان لیتا ہوں کہ کتنا گہرا ہے، کس رنگ و بو کا ہے؟ کس جگہ سے نکلتا ہے؟ اس کا مزہ کیسا ہے؟ اگر آپ اپنے لشکر کے ساتھ مجھے رہنے کی اجازت دیجیے تو میں مفید ثابت ہوں گا۔''

حضرت نے فرمایا۔'' بے شک تمھارا فوج کے ساتھ ہونا بہت مفید ہوگا۔ جنگل صحرا میں ہر جگہ پانی کی کھوج لگا لوگے اور فوج کو کہیں پیاس کی مصیبت نہ اُٹھانی پڑے گی۔ تم ضرور ہماری فوج کے ساتھ رہا کرو۔''

کوّے نے ہُدہُد کی عزت بڑھتے دیکھی تو مارے حَسد کے جل گیا اور موقع پا کر حضرت سے کہا۔'' حضور ہُدہُد اپنی نظر کی جھوٹ مُوٹ ڈینگیں مارتا ہے۔ اگر یہ ایسا نظر کا تیز ہوتا تو پھر جال میں پھنس کر مرتا ہی کیوں؟ جال نہ دیکھ لیتا؟''

حضرت نے ہُدہُد سے پوچھا۔'' کیا تم نے ہم سے غلط بات کہی؟ اگر ایسا کیا ہے تو بہت بُرا کیا!''

ہُدہُد نے بہت ادب سے کہا۔'' حضرت اگر میری بات غلط نکلے تو جو چور کی سزا وہ میری۔ میں غلط بات کبھی نہیں کہوں گا۔ کوّا میرا ہمیشہ سے دشمن ہے۔ یونہی جھوٹ سچ لگایا کرتا ہے۔ نہ اس کا کوئی دین ہے نہ ایمان۔ پکا بے ایمان ہے۔ اس کی باتوں پر آپ نہ جائیے۔ میں تو آسمان کی اونچائی سے بھی جال دیکھ سکتا ہوں۔ اگر موت کا وقت ہی آجائے تو اور بات ہے۔ پھر عقل پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ چاند کالا اور سورج بے نور نظر آنے لگتا ہے۔ قضا سے بھلا کس کو انکار ہے۔''

□□□

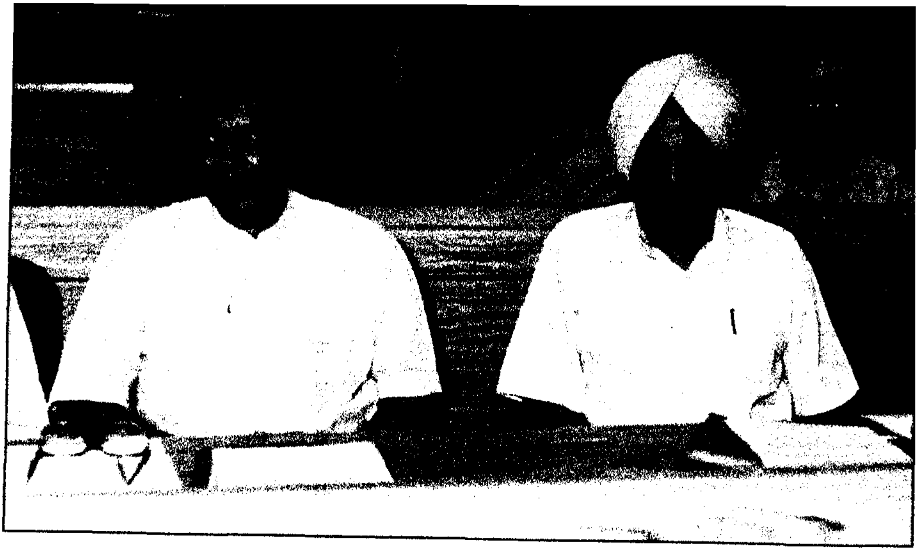

''اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم پر گفتگو'' کے زیر عنوان منعقدہ کانفرنس کے موقعے پر لی گئی تصویر میں سردار ترلوچن سنگھ (چیئرمین قومی اقلیتی کمیشن)،
جناب آسکر فرنانڈیز اور جناب سید شہاب الدین (دوسری قطار میں بائیں)۔

مصر کی نوجوان فکشن نگار محترمہ میرال الطحاوی کے ناول "الخباء" کے ہندی ترجمے "خیمہ" کی رسم اجرا ہندی کے معروف ادیب وشاعر جناب اشوک واجپئی کے ہاتھوں 29 مئی 2004 کو سنسکرتی بھون،
نئی دہلی میں عمل میں آئی۔ میرال الطحاوی کے اس ناول کا ترجمہ دنیا کی 13 زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ہندی ترجمہ ڈاکٹر ارجمند آرا نے کیا ہے جو "اردو دنیا" کی معاون مدیر رہ چکی ہیں۔
تصویر میں (دائیں سے) محترمہ میرال الطحاوی، جناب اشوک واجپئی اور ڈاکٹر ارجمند آرا۔

URDU DUNIYA Monthly, September 2006, Vol. 8, Issue. 9
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H R.D., Government of India, New Delhi

قومی اردو کونسل نے چلڈرن بک ٹرسٹ اور بچوں کا ادبی ٹرسٹ کے اشتراک سے بچوں کی ذہنی تربیت کو مدنظر رکھتے ہوئے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہیں۔ ان کتابوں سے بچوں کی تفریح بھی ہوتی ہے اور ان کی معلومات میں اضافہ بھی۔ کتابوں میں دی گئی خوبصورت تصاویر بچوں کو بے حد پسند آئیں گی۔

بھیڑیا

مصنف: اے۔ کے۔ شری کمار/ مترجم: جسکین زیدی

شکاری کہانیاں دلچسپ بھی ہوتی ہیں اور معلوماتی بھی۔ "بھیڑیا" بھی ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں بڑے دلچسپ انداز میں بھیڑیوں کے شکار کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس شکار کے دوران دو انسانی بچے بھی بھیڑیوں کا ساتھ دیتے ہوئے ملے۔ یہ کون تھے یہ جاننے کے لیے کتاب کا مطالعہ کیجیے۔

صفحات: 104، قیمت: -/28 روپے

چیتوں کے دیس میں حیرت انگیز کارنامہ

مصنف: شلیجہ موہن/ مترجم: محمد علیم

جنگلی جانوروں کا شکار جتنا دلچسپ ہوتا ہے اتنا ہی خطرناک بھی۔ بچوں کو ایسی کہانیاں بہت پسند ہوتی ہیں جن میں شکار کے دلچسپ واقعات بیان کیے گئے ہوں۔ "چیتوں کے دیس میں حیرت انگیز کارنامہ" ایسی ہی ایک کتاب ہے۔

صفحات: 69، قیمت: -/22 روپے

کوٹی امّا

مصنف: شیلا دھیر/ مترجم: محمد علیم

کارزار حیات میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو مخالف حالات میں بھی خوش رہنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ "کوٹی امّا" ایک ایسی ہی عورت کی کہانی ہے جسے بچے بے حد پسند کریں گے۔

صفحات: 16، قیمت: -/18 روپے

گاؤں میں بندر آگئے

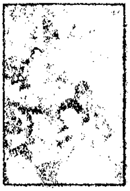

مصنف: سواتی بھٹا چارجی/ مترجم: محمد فرحت عزیز

محبت اور شفقت کی زبان انسان ہی نہیں حیوان بھی سمجھتے ہیں۔ نونو نے ایک زخمی بندر کا علاج کیا اور وہ اس کا دوست بن گیا۔ آگے کیا ہوا یہ جاننے کے لیے پوری کتاب کا مطالعہ کیجیے۔

صفحات: 16، قیمت: 18 روپے

دیو پیکر پہاڑ کا راز

مصنف: شلیجہ موہن/ مترجم: سید ظفر الاسلام

کوہ پیمائی ایک ایسا مشغلہ ہے جس میں قدم قدم پر جان جانے کا خوف رہتا ہے لیکن اس میں ایڈونچر بھی زبردست ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک کہانی جس میں قاری کا تجسس برابر بڑھتا جاتا ہے۔

صفحات: 88، قیمت: -/24 روپے

دولت کا بکس

مصنف: سروجنی سنہا/ مترجم: نجمہ نقوی

1857 کی پہلی جنگ آزادی اگرچہ ناکام ہوگئی تھی لیکن اس سے یہ اندازہ ہوگیا کہ انگریز ناقابل تسخیر نہیں ہیں۔ "دولت کا بکس" میں دلچسپ انداز میں 1857 کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

صفحات: 133، قیمت: -/36 روپے

بنجارہ لڑکے

مصنف: مالکیا دیتا/ مترجم: ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

بچوں کی تربیت اگر مناسب انداز میں کی جائے تو شریر اور ضدی بچوں کو بھی راہ راست پر لایا جاسکتا ہے۔ "بنجارہ لڑکے" ایک ایسے ہی بچے کی کہانی ہے جس نے اپنے والدین کو تنگ کر رکھا تھا۔ ایک نصیحت آموز کہانی جو بچوں کو ضرور پسند آئے گی۔

صفحات: 48، قیمت: -/35 روپے

پانی کے کرشمے

مصنف: جے جا ہری/ مترجم: اقبال مہدی

پانی کے بغیر زندگی کا تصور محال ہے۔ مہد سے لحد تک قدم قدم پر پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ "پانی کے کرشمے" میں پانی سے متعلق تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ ایک بے حد معلوماتی کتاب جو بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کو بھی پسند آئے گی۔

صفحات: 96، قیمت: -/70 روپے

نوٹ: طالب علموں اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

Printed and Published by Director, NCPUL on behalf of NCPUL, Printed at J.K. Offset Printers,
[illegible]